# سوئزرلینڈ میں

## میرے چند شب و روز

حکیم محمد سعید

# سوئزرلینڈ میں

## میرے چند شب و روز

حکیم محمد سعید

ہمدرد اکیڈمی، پاکستان

# عنوانات


| صفحہ | عنوان |
|---|---|
| ۵- | حرف اول |
| ۹- | ابتدائیہ |
| ۱۲- | دوبئی پر |
| ۱۲- | درد سر |
| ۱۳- | کہر چھا گئی |
| ۱۵- | نیا گل کھلا |
| ۱۸- | پروفیسر برگل |
| ۲۰- | پہلی منزل |
| ۲۱- | سوئزر لینڈ |
| ۲۳- | زبانیں |
| ۲۷- | لسانی تبدیلی |
| ۲۷- | دیسی زبان |
| ۳۰- | مذاہب |
| ۳۱- | جغرافیائی حالات |
| ۳۳- | برفانی تودے ، جھیلیں |
| ۳۴- | آبادی |
| ۳۷- | تاریخی حالات |
| ۴۱- | برن ـــ بازل |
| ۴۲- | برن |
| ۴۳- | بازل |
| ۴۴- | برگل سے تبادل خیالات |
| ۴۵- | سینڈوز |
| ۴۷- | چڑیا گھر |
| ۵۰- | ریلوے نظام |
| ۵۲- | شاہراہیں |
| ۵۳- | جہاز رانی |
| ۵۴- | عوامی رابطے |
| ۵۴- | کاک ٹیل |
| ۵۸- | برن میں |
| ۵۸- | نظام زندگی میں بے قاعدگی |
| ۶۰- | جامع برن میں موضوع خطاب |
| ۶۱- | تعلیم |
| ۶۷- | تربیت اساتذہ |
| ۶۹- | شعبۂ طبیعیات |
| ۷۳- | ظہرانہ سفیر پاکستان |
| ۷۴- | پروفیسر برگل کے علم کدہ میں |
| ۷۷- | تقریر کے لیے تیاری |

| صفحہ | عنوان |
|---|---|
| ۷۸ | جامع برن میں |
| ۸۱ | عشائیہ سائنس کونسل |
| ۸۱ | معاوضۂ مقالہ |
| ۸۵ | سوئس ہفتہ وار اخبار |
| ۹۰ | پابندیٔ وقت |
| ۹۳ | میرا پیارا وطن |
| ۹۶ | پروہیلو یتیا |
| ۹۷ | روایت اور رسم و رواج |
| ۱۰۶ | نظام حکومت |
| ۱۰۹ | ضرورت سے زیادہ روزگار |
| ۱۱۰ | صنعت و حرفت |
| ۱۱۲ | بنکاری |
| ۱۱۴ | بود میر یانا لائبریری |
| ۱۱۷ | عالمی ادارۂ صحت |
| ۱۱۸ | ڈاکٹر عبدالسلام |
| ۱۱۸ | افضل محمود صاحب |
| ۱۲۰ | جنیوا میں جمعۃ المبارک |
| ۱۲۳ | ایک پینٹنگ |
| ۱۲۸ | عالمی ادارۂ عمال |
| ۱۳۰ | ڈوکومنٹ سینٹر |
| ۱۳۱ | نماز جمعہ |
| ۱۳۱ | بین الاقوامی انجمن صلیب احمر |
| ۱۳۲ | انجمن ہائے صلیب احمر |
| ۱۳۹ | عالمی اداروں کا مرکز |
| ۱۴۰ | مواصلات کی بین الاقوامی انجمن |
| ۱۴۱ | ڈاک کی عالمگیر انجمن |
| ۱۴۳ | عالمی ادارۂ صحت |
| ۱۴۶ | عالمی ادارۂ موسمیات |
| ۱۴۸ | محصول اور تجارت کا عام معاہدہ |
| ۱۵۰ | غیر سرکاری ادارے |
| ۱۵۱ | دوسرے دفاتر اور ادارے |
| ۱۵۳ | غیر جانب داریت کی پالیسی |
| ۱۵۶ | اقوام متحدہ کے یورپی دفتر میں |
| ۱۵۷ | نیند کیوں رات بھر نہیں آتی |
| ۱۶۵ | حدیقۂ نباتات |
| ۱۶۷ | جنیوا سے زیورخ |
| ۱۶۸ | قومی ترانہ |
| ۱۷۲ | قومی پرچم |
| ۱۸۱ | آخری قدم |
| ۱۸۱ | اخلاق اسلامی |
| ۱۹۱ | سوئس انسٹی ٹیوٹ اوف ٹکنولوجی |
| ۱۹۱ | ٹیکنیکل لائبریری |
| ۱۹۲ | بچوں کے مراکز |
| ۱۹۳ | سوئس فاؤنڈیشن |
| ۱۹۵ | مڈیکل سنٹر میں |

# حرف اول

ایک نامور طبیب ، ایک ممتاز مصنف ، ایک مدیر شہیر اور ایک اعلا منتظم کے علاوہ ایک فعال اور ایک ہر دل عزیز انسان کی حیثیت سے جناب حکیم محمد سعید کی شہرت و مقبولیت بلندیوں کو چھو رہی ہے ، لیکن ان حیثیات کے علاوہ وہ ایک جہاں گشت بھی ہیں - اپنی ذاتی حیثیت میں انہوں نے بیرونی ملکوں کے جتنے سفر — طویل اور کثیر سفر کیے ہیں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی - حکیم صاحب پیشہ ور سیاح نہ ہوتے ہوئے بھی جس طرح سفر میں رہتے ہیں اس پر تعجب ہوتا ہے - حکیم صاحب پیشہ ور سیاح نہیں ہیں ، یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ وہ اکثر سفر کرنے کے باوجود حضر اور قیام کے تمام تقاضے اور اپنے معمولات بھی پورے کرتے ہیں - مطب کرتے ہیں ، لکھتے پڑھتے ہیں ، تنظیمی اور فنی امور انجام دیتے ہیں - دفتر میں بیٹھتے ہیں ، شادی و غمی میں شرکت کرتے ہیں ، عزیزوں سے ملتے ہیں ، اور کم سے کم مجھے سب سے زیادہ حیرت جس بات پر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں روزانہ اپنی ڈائری بھی لکھتے ہیں - سفر میں انسان اپنے معمولات پر قابو نہیں رکھ سکتا اور نظم اوقات بگڑ ہی جاتا ہے ، اس لیے اکثر اہل علم و قلم سے لکھنا پڑھنا تک چھوٹ جاتا ہے ، ڈائری لکھنا تو بڑی بات ہے ، لیکن حکیم صاحب کو اپنے ذہن اور اعصاب پر اتنا قابو ہے کہ سفر میں بھی پابندی سے وہ اپنا روزنامچہ لکھتے ہیں -

حکیم صاحب نے سیکڑوں ہی سفر کیے ہوں گے ، اور اب تو کوئی ایسا براعظم نہیں رہا جہاں وہ نہ گئے ہوں - یہ سفر بیشتر علمی نوعیت کے ہوتے ہیں - کسی بین الاقوامی کانفرنس میں

شرکت کرنی ہے ، کسی یونی ورسٹی یا طبی یا دینی ادارے میں لکچر دینا ہے یا کسی علمی ادارے نے دعوت دی ہے یا پاکستان میں حکیم صاحب خود کوئی بین الاقوامی کانفرنس کر رہے ہیں ، اس کے سلسلے میں اہل علم سے مشورہ کرنا اور ان کو شرکت کی دعوت دینا ہے ، ضمناً دوسرے ملکوں میں بھی جانا ہے ، اور حکیم صاحب نے اپنا رخت سفر باندھ لیا ۔ ہوائی سفر کی وجہ سے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مولانا حسرت موہانی بن جاتے ہیں ، چند کپڑے ، چند کتابیں ، کاغذ قلم اور چند تحفے جو وہ اہل قلم کو دیتے ہیں ، بس عموماً یہی ان کا زاد راہ ہوتا ہے ۔

یوں تو حکیم صاحب نے ۱۹۲۷ء میں حج بیت اللہ کے سلسلے میں پہلا سفر کیا تھا ، لیکن بد و شعور کے بعد ۱۹۴۸ء میں مصر ، ۱۹۵۲ء میں انڈونیشیا ، ملایا ، فلی پینز اور سیام ( تھائی لینڈ ) کے سفر کیے ۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں یورپ کے چند ممالک کا ایک طویل سفر کیا جو کم و بیش تین ماہ جاری رہا ۔ ۱۹۵۶ء کے سفر کے حالات حکیم صاحب لکھ چکے ہیں ۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے دنیا کے اکثر بڑے ملکوں کا سفر کیا ۔ اب تک حکیم صاحب کے یہ سفر نامے شائع ہوچکے ہیں :

یورپ نامہ ( ۱۹۶۰ء )

جرمنی نامہ ( ۱۹۶۶ء )

شب و روز — تاثرات سفر دمشق ، حلب و جدہ

ماہ و روز — روز نامچۂ سفر روس (۱۹۸۰ء)

چین کے سفر (۱۹۶۳ء) کے نتیجے میں حکیم صاحب نے سفر نامے کے بجائے انگریزی میں ایک کتاب مڈیسن ان چائنا (Medicine in China) لکھی تھی جس میں چین کی قدیم

طب کا تاریخی اور ارتقائی جائزہ لیا تھا ۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے جس میں نیا سواد شامل کر کے حکیم صاحب نے بہت سے اضافے کیے ہیں ۔

زیر نظر کتاب سوئزر لینڈ کا سفر نامہ ہے ، جہاں حکیم صاحب ۱۹۷۰ء میں برن یونی ورسٹی اور سوئس فاؤنڈیشن کی دعوت پر طب قدیم و جدید کی اقدار مشترک و اقدار مختلف پر مقالہ پڑھنے چند دن کے لیے گئے تھے ، لیکن چند دنوں میں ہی حکیم صاحب نے سوئزر لینڈ کے علمی اور بین الاقوامی اداروں کا جس گہرائی اور دل دچسپی سے مطالعہ کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے ۔ حکیم صاحب نے اس غیر جانبدار ملک کے مطالعے و مشاہدے کے ساتھ ساتھ اس ملک کی تاریخ اور اس قوم کے مزاج کو پڑھ ڈالا ہے ۔ سفر ناموں میں حکیم صاحب کا طرز تحریر تحقیقی مقالات اور فنی مضامین سے بالکل مختلف ہے ۔ وہ لمحے لمحے کا حال اتنی روانی اور شگفتگی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خود حکیم صاحب کے ساتھ ہے اور سب کچھ بچشم خود دیکھ رہا ہے ۔ وہ کسی شخص سے ملیں گے تو اس کا تعارف چند سطروں میں اس طرح کرادیں گے کہ قاری کے لیے وہ ذرا اجنبی نہیں رہے گا ۔ کسی ادارے کو دیکھیں گے تو اس کی ہیئت ، اس کے نظام و انتظام اور اس کے عہدے داروں اور کارکنان تک کے متعلق تاثرات بیان کردیں گے ۔ حالات حاضرہ کے ساتھ وہ ملک اور ادارے کی تاریخ سے بھی قاری کو باخبر کردیتے ہیں جو بعض وقت مجھ جیسے بے چین قاری کو شاق بھی گزرتی ہے کہ اس طرح تھوڑی دیر کے لیے حکیم صاحب کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے ، لیکن اس طرز کی معلومات افزائی میں شبہ نہیں ۔

حکیم صاحب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ

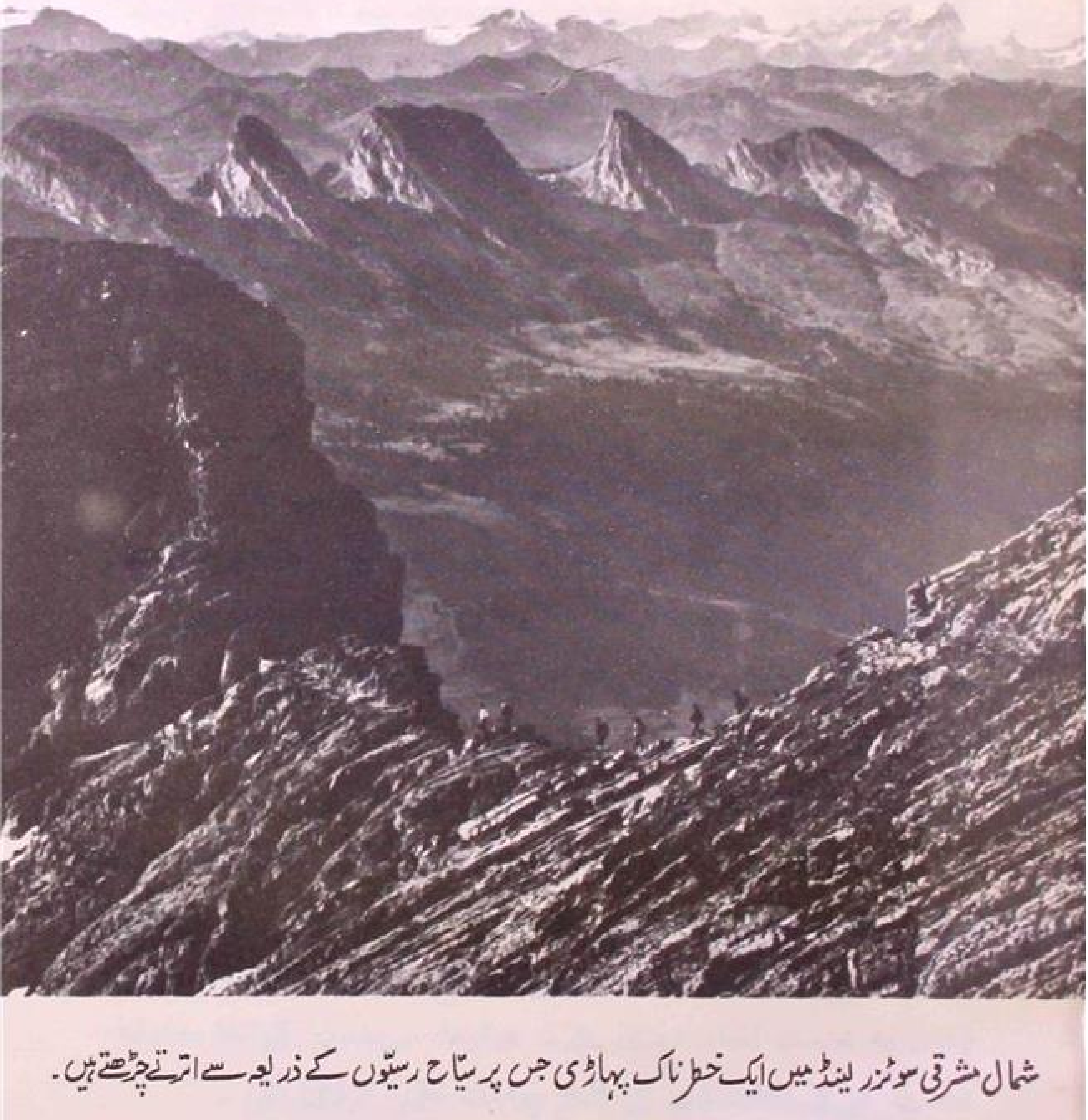
کہیں بھی ہوں ، کسی **ملک** ، کسی ادارے ، کسی اسکالر کے گھر میں ، کسی ہوٹل میں ، کسی جلسے میں اپنا **ملک** اور ماضی ان سے دور نہیں ہوتا ۔ وہ وہاں کے حالات کو اپنے وطن کے حالات سے ملانے لگتے ہیں ۔ اپنے لوگوں کی کوتاہیوں اور غفلتوں کے مقابلے میں ان لوگوں کے حسن عمل کو دیکھ کر ملول و مضطرب ہوجاتے ہیں اور اصلاح حال کی تدابیر پر غور کرنے لگتے ہیں ۔ وہاں کے حال کی رفعتوں کو دیکھ کر اپنے ماضی کی عظمتوں کو یاد کرنے لگتے ہیں ۔ وہاں کے مشاہیر سے مل کر اپنے اسلاف کا تصور کرنے لگتے ہیں ۔ گویا حکیم صاحب حال میں سفر کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی میں بھی سفر کرتے ہیں ۔ ان کے سفر ناموں میں مشاہدۂ موجود کے علاوہ مطالعۂ ماضی بھی ہوتا ہے ، اور یہ طرز قاری کے ذہن کو جذب کرنے کے لیے کافی موثر ہے ۔

ہمدرد اکیڈمی کی مطبوعات میں اس کتاب کی اشاعت سے ایک وقیع اور دل کش کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس کے فوراً بعد ہم حکیم صاحب محترم کا ایک اور سفر نامہ پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے اوسٹریلیا کے دو سفروں کے بعد لکھا ہے اور اکیڈمی نے اس کی اشاعت کا کام ہاتھ میں لے لیا ہے ۔ حکیم صاحب نے جاپان نامہ پر نظرثانی کا وعدہ بھی فرمایا ہے جس کی یاد داشتیں انہوں نے ۱۹۷۴ء میں سفر جاپان میں لکھی تھیں ۔ کاغذ کی گرانی اور نایابی حائل نہ ہوئی تو ہمدرد اکیڈمی ۱۹۸۰ء میں " مقالات شام ہمدرد ۶۶-۱۹۶۵ء " اور ۱۹۸۱ء میں جاپان نامہ اور متعدد دوسری کتب پیش کرسکے گی ۔

**مسعود احمد برکاتی**

**ناظم شعبۂ تحقیق و تصنیف ہمدرد**

کراچی ، ستمبر ۱۹۸۰ء



شمال مشرقی سوئٹزر لینڈ میں ایک خطرناک پہاڑی جس پر سیاح رسیوں کے ذریعہ سے اترتے چڑھتے ہیں۔

# ابتدائیہ

اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ گزشتہ کئی سالوں سے میری زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ ہوائی جہازوں کے دوش پر فضائی سفروں میں بسر ہورہا ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ خدمت خلق و فن نیز ترویج علم و حکمت کے لیے کافی عرصے تک اس طور پر گزرتا ہی رہیگا۔ مطب ہمدرد کے زیر اہتمام متعدد شہروں میں مریضوں کی خدمت و علاج کے لیے مجھے ہر ماہ کراچی سے پشاور، راول پنڈی، حیدرآباد اور لاہور کے سفر کرنے ہوتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ میں ڈھاکہ، مشرقی پاکستان بھی ہر انگریزی مہینے کی دوسری جمعرات کو مطب کرنے جایا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا تو وہ ملک غیر ہوا۔ میرا جانا ترک ہوا۔ اس کے بعد میں نے لندن میں مطب کو اپنے پروگرام میں شریک کرلیا کہ برطانیہ میں طب مشرقی کی داغ بیل ڈال دوں۔ میں نے وہاں یہ خدمت انجام دیدی ہے۔ ہزارہا مریضوں کی بلا معاوضہ خدمت کرکے وہاں طب کی اعلا روایات قائم کردی ہیں۔

پاکستان سے باہر اہل علم قدر داں ہیں اور وہ مجھے علمی و سائنسی عالمی اجتماعات میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ جامعات بھی مجھے دعوت تقریر دیا کرتی ہیں، اور میں اس علمی قدردانی سے متاثر ہوتا ہوں۔ اہل علم کی محبت مجھے ملک سے

باھر لے جایا کرتی ھے۔

۱۹۷۵ء کے شروع ھی میں مجھے سوئزر لینڈ کی برن یونیورسٹی اور پروھلویتیا (سوئس فاؤنڈیشن) سے ایک تقریر کی دعوت مل گئی تھی۔ چونکہ پروفیسر برگل اور ان کی شریک حیات کی تعارفی تحریک پر یہ اہتمام ہوا تھا اور ان کی خاطر مجھے عزیز تھی، اس لئے اپنی مختلف النوع مصروفیات کے باوجود اس دعوت کو قبول کرنا میرے لئے بڑا دل پسند فیصلہ تھا۔ قبولیت دعوت جس قدر آسان کام تھا جامعۂ برن میں پیش کرنے کے لئے ایک مقالہ تیار کرنا اتنا ھی سخت و مشکل مرحلہ تھا مگر، میں اس جد و جہد سے راحت پاتا ھوں۔

میں اپنے ملک سے باھر محض سیر و تفریح کی خاطر بہت کم نکلتا ھوں۔ لیکن دو بچیاں سوئزر لینڈ کی سیر کرنے کی خاطر میرے ھمراہ جانے کے لئے مصر ھوئیں اور میں ان کی دل شکنی گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ان کو اجازت دی کہ وہ بھی اپنا رخت سفر باندھ لیں۔ ان میں سے ایک میری اپنی بیٹی مسز سعدیہ راشد ھے اور دوسری آنسہ فاخرہ الیاس*۔ ان کے علاوہ ھمدرد کی ایک ایگزیکٹو مسز ایل ۔ اے ۔ ڈی ۔ سلوا ھیں، جو میری پرسنل سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتی ھیں اور جنھیں میں ھمدرد میں ان کی پرخلوص اور انسانیت پرور خدمات کے پیش نظر خانم ڈی سلوا کہتا ھوں۔

اس سفر میں خانم ڈی سلوا کی موجودگی ضروری تھی۔

---

* آہ! کس قلب و قلم سے یہ حادثۂ فاجعہ رقم کروں کہ ۷ جنوری ۱۹۷۸ء کو فاخرہ ھم سے ھمیشہ ھمیشہ کے لئے جدا ھوگئی ھے۔ پہلے بچے کی پیدائش کے دوران غفلت و قسمت نے فاخرہ کی آنکھیں بند کردیں۔ حارث اس کی نشانی اب ھمارے درد کا درماں ھے۔

وہ میرے راہ نامے اور روزنامچے کا خیال رکھتی ہیں ۔ وہ خود بھی شریک سفر ہونا چاہتی تھیں تا کہ جب ہمارا جہاز مغربی جرمنی پہنچے تو وہ اپنے بڑے بیٹے ماسٹر ٹیری ڈی سلوا سے مل لیں جو عرصہ چار سال سے وہاں زیر تعلیم ہے اور مصلحت بیں ماں محض بچے کے شاندار مستقبل کی خاطر اس جدائی کا صدمہ برداشت کر رہی ہے ۔

١٠ فروری ١٩٧٥ء کو قلب یورپ کے علمی سفر پر ہم چاروں کا قافلہ ضروری اور غیر ضروری سامان کے ساتھ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوگیا ۔ پروگرام اور تعین وقت کے مطابق ہم سب رات کے گیارہ بجے پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز ( پی ۔ آئی ۔ اے ) کے طیارے میں سوار ہوکر کراچی سے چل پڑے ۔ اب یہ سفر محض سوئزر لینڈ کا نہ تھا ۔ میں نے مطالعے کی خاطر اور ان بچوں کی پوری سیاحت کے خیال سے اس کو وسعت دیدی تھی اور کئی ممالک شامل کر لیے تھے ۔ جرمنی ، انگلستان ، فرانس ، اردن ، مصر ، لبنان ۔

میرے سامان میں پینتیس پونڈ وزنی کاغذات ( فائل وغیرہ ) اور پینسٹھ پونڈ وزنی علمی کتابیں فوری حوالے کے لئے شامل تھیں ۔ ان کے علاوہ تقریباً کئی سو پونڈ وزنی لٹریچر بذریعہ ہوائی ڈاک جگہ جگہ پہلے ہی روانہ کیا جا چکا تھا ۔ اہل علم و حکمت سے روابط کا ایک وسیع پروگرام تھا اور ان کے لیے علمی ہدایا ایک ضرورت ۔ ہمارے سفر کی مجموعی مدت ڈیڑھ ماہ تھی ۔ ہمیں سوئزر لینڈ میں جنیوا ، برن ، زیورخ ، انگلستان میں لندن ، کیمبرج ، اوکسفرڈ اور ایڈنبرا ، فرانس میں صرف پیرس ، مغربی جرمنی میں فرینکفرٹ ، کولون ، میونخ ، لبنان میں بیروت ، شام میں دمشق ، اردن میں عمان اور مصر میں قاہرہ و اسکندریہ جانا تھا ۔ ہر جگہ

علمی مذاکرات اور علمی روابط مقصد سفر تھا - روانگی سے قبل ہم نے دعا مانگی کہ اللہ تبارک تعالیٰ اس پر مقصد سفر کو ہر طور سے کامیاب بنائے اور ہم اطمینان کلّی کے ساتھ واپس آئیں -

## دوبئی پر

صبح تک کا وقت رت جگے میں گزرا - کراچی سے روانہ ہونے کے کوئی دو گھنٹے بعد ہوائی جہاز دوبئی پر اترا - دوبئی کا ہوائی میدان میں نے ایک سال پیشتر ۱ء اپریل میں کھڑے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جھانک کر ہی یکھا تھا - اس دفعہ ہم سب نے جہاز سے اتر کر عمارت کی سیر کی - بہت بڑی عمارت ہے اور ریاست کی بے پناہ خوشحالی اور امارت کی مظہر ہے - سنا ہے کہ اندرون ملک دولت کی ریل پیل ہے - سینکڑوں کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہزاروں لاکھوں کی بات ہوا کرتی ہے - ایک کیمرہ ساتھ لینے کا ارادہ تھا - دوبئی کے ہوائی میدان سے لاؤنج میں آ کر ایک عام کیمرہ خریدنے کا ارادہ تھا ، مگر وقت نہ مل سکا - تقریباً ۵۰ منٹ بعد جہاز روانہ ہو کر دو گھنٹے میں کویت پہنچ گیا - یہاں اترنے کی ہمت نہیں تھی - اس کے ڈھائی گھنٹے بعد جہاز نے دمشق میں اپنے پہیئے جما لئے - یہاں سخت سردی تھی - کپتان نے جہاز ہی میں رہنے کا مشورہ دیا - یوں بھی پروگرام کے مطابق اس وقت وہاں اترنا مقصود سفر نہیں تھا - لہذا وہاں سے روانہ ہوئے - اب جہاز کا نیا عملہ ڈیوٹی پر آ گیا تھا - پہلے عملے نے بتایا تھا کہ دمشق سے جنیوا تک ساڑھے تین گھنٹے کا راستہ ہے - مگر نئے عملے نے ساڑھے چار گھنٹے بتائے -

## درد سر

نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا - ہم سب کے سروں

میں درد ہورہا تھا ۔ غالباً جہاز کے پریشر ( دباؤ ) میں کوئی سقم تھا ۔ کانوں پر بھی برا اثر پڑ رہا تھا ۔ میں تو سفر کا اس درجہ عادی ہوگیا ہوں کہ معمولی بیقاعدگی ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی ۔ لیکن اس دفعہ میرے کان بھی بند ہونے لگے تھے ۔ باقی شرکائے سفر کا بھی یہی حال تھا ۔ میں نے سال گزشتہ پاکستانی جہاز میں نیو یارک سے کراچی تک سفر کیا تھا ۔ کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی ۔ مگر اس سفر کے دوران میں کچھ جھول محسوس ہوئے ۔

میں رات بھر سو نہیں سکا تھا ۔ اس لئے سفیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی وضو کیا اور نماز فجر اشاروں سے ادا کرلی ۔ سمت کا لحاظ بھی ایسی صورت میں ضروری نہیں ہوتا ۔ ابھی جنیوا پہنچنے میں تقریباً تین گھنٹے باقی تھے ۔ میں نے بریف کیس کھول لیا ۔ کراچی میں کچھ کام کرنا باقی رہ گیا تھا ۔ سوچا کہ اسے پورا کرلوں ۔ سب سے پہلے اپنے ماہنامہ " اخبارالطب " کا اداریہ لکھ لیا ۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی ہدایات کے ضمن میں تیار کرلیا تا کہ اولین فرصت میں اسے ہوائی ڈاک کے ذریعہ سے کراچی بھیج سکوں ۔

## کہر چھا گئی

ہم منتظر تھے کہ اب جنیوا میں اترنے کا اعلان ہوگا ۔ خانم ڈی سلوا نے اپنے لڑکے کو مطلع کردیا تھا کہ ہمارا قافلہ پہنچنے والا ہے ۔ چار سال بعد ماں اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے بیتاب تھی ، مگر کپتان کے مقام سے اعلان ہوا کہ جنیوا پر سخت کہر چھائی ہوئی ہے، رن وے پر فلڈ لائٹ ہونے کے باوجود کچھ نظر نہیں آتا ۔ کنٹرول ٹاور نے اترنے کی اجازت نہیں دی ۔ لہذا جہاز لندن کی سمت چل پڑا ۔ خانم پر اس اعلان کا بہت برا اثر ہوا ۔

وہ قدرتی طور پر آبدیدہ ہوگئیں ۔ مجھے یہ غم تھا کہ اب سارے پروگرام میں گڑبڑ ہوجائیگی ۔ یہ بھی یقین نہیں تھا کہ لندن سے جنیوا واپس آنا کب ممکن ہوگا۔ جنیوا کے بعد برن جانے کے پروگرام میں بھی رخنہ پڑسکتا تھا ۔ کچھ وقت اس سوچ بچار میں گزرا کہ ایک دم پھر اعلان ہوا کہ لندن کی فضا بھی صاف نہیں ہے ، وہاں بھی اترنے کی اجازت نہیں مل سکی ۔ لہذا جہاز نے پیرس کے لئے اپنا رخ موڑ لیا ہے ۔ یہ مرحلہ اب سخت تھا ۔ برن میں جو پروگرام ترتیب دیا گیا ہے اس میں رخنہ پڑ جائے گا اور اس سے سب ہی کو تکلیف ہوگی ۔ مگر اس بے بسی کا علاج تھا بھی کیا ! جہاز پیرس میں اورلی کے ہوائی میدان پر اتر گیا ۔ اس وقت شام کے تین بج چکے تھے ۔ غیر یقینی صورت حالات نے اعصاب کو خاصا خراب کر دیا تھا ۔ دونوں بچیوں پر زیادہ اثر نہیں تھا ، کیونکہ ان کا مقصد سفر مختلف تھا۔ مگر میں اور خانم ڈی سلوا بہت متاثر تھے، اور ہمارے تاثرات کی نوعیت بھی جدا گانہ تھی۔ چونکہ بی۔ آئی۔ اے کا جہاز بالکل غیر متوقع طور پر اورلی پر اترا تھا اس لئے ضروری عملہؐ بی۔ آئی۔ اے وہاں موجود نہ تھا ۔ منتظمین کی اطلاع پر چند کارکنان آگئے اور وہ قدرتی طور پر زیادہ مستعد نظر آرہے تھے ۔ میں نے ان پر زور دیا کہ اب جو پہلا جہاز یہاں سے جنیوا جائے اس میں ہمیں سوار کرا دیا جائے تا کہ ہمارے پروگرام میں اور زیادہ جھول نہ پڑے ۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم بی۔ آئی۔ اے ہی سے سفر کریں ۔ کسی دوسرے جہاز میں سفر کرنے پر فاضل رقم دینے کا میں نے فیصلہ کرلیا ۔ مسلسل تگ ودو کے نتیجے میں بالآخر ۵ بجے شام روانہ ہونے والے سوئس ایئر کے ایک جہاز میں جگہ مل گئی اور ٹورسٹ کلاس ہی میں انتظام ہوگیا ۔ میں تو کسی طرح برن پہنچنے کے لیے فرسٹ



آبی گزرگاہ کے ایک طرف سیّاحوں کی دیکھ بھال کا سرکاری دفتر اور دوسری طرف ریستوراں سب کچھ پینے کے لیے ہے۔

کلاس کے ٹکٹ خریدنے پر بھی آمادہ تھا۔

پی ۔ آئی ۔ اے کے ذمہ دار لوگ جانتے تھے کہ ہمیں پریشانی ہوئی ، مگر فضائی کیفیات کے سامنے وہ بھی مجبور تھے ۔ انہوں نے ہمارے پیغامات ٹیلکس کے ذریعہ سے جنیوا اور برن بھجوا دئے تا کہ ہمارے منتظر میزبانوں کو اس صورت حالات کا علم ہوجائے اور کچھ نہیں تو یہ ضرور معلوم ہوجائے کہ ہم پاکستان سے چل چکے ہیں اور موسمی حالات کے رحم و کرم پر ہیں ۔ منتظمین نے ہمارے اطمینان کے لئے اپنی ایک کارکن کو مستقل طور پر ہمارے ساتھ رکھا تا کہ ہماری مشکلات آسان ہوتی رہیں ۔ ان دنوں ہوائی جہاز اغوا ہونے کے واقعات نے بھی یورپ کے ہر ایئر پورٹ کو بے حد محتاط کردیا تھا ۔ وہ ہر ایشیائی کو فلسطینی سمجھتے اور اسے شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ یہ غنیمت ہے کہ میرے ساتھ تین ایسی خواتین تھیں جن کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ۔ البتہ جہاز میں ایک عرب نژاد بھی تھا ، جس پر خواہ مخواہ نظریں پڑرہی تھیں ۔ حالانکہ میرے خیال میں وہ بالکل بے ضرر تھا ، چہرے سے بھی معصوم معلوم ہوتا تھا ۔ لہذا جب تک ہم سوئس ایئر کے جہاز میں سوار نہ ہوگئے پریشانی کا عالم طاری رہا ۔

## نیا گل کھلا

جہاز جنیوا کے ہوائی میدان پر پہنچا تو ایک نیا گل کھلا جس کا طبیعت پر ناگوار اثر ہوا ۔ اصل محرک تو وہ عرب تھا جو اس جہاز سے سفر کر رہا تھا اور جسے مشکوک نظروں سے دیکھا جارہا تھا ۔ اسے ایئر پورٹ کے اندر ہی روک لیا گیا ۔ ہماری موجودگی میں اس سے کوئی باز پرس تو نہیں ہوئی البتہ سابقہ سہولتوں کے برعکس ہمیں بھی خاصا پریشان کیا گیا ۔ ہمارے

سامان کی ایک ایک چیز کھول کر دیکھی گئی - عملے نے سوٹ کیسوں کی تہوں کو اس خیال سے ٹٹولا کہ اس میں چرس چھپا ہوا نہ ہو۔ میں چاندی کی کچھ مصنوعات لے گیا تھا جو تحفہ کے طور پر اپنے ملنے والوں کو دینی تھیں - انہیں قابل اعتراض سمجھا گیا اور ان پر ڈیوٹی لگادی گئی - عام طور پر ایسی چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے - میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس تمام سامان کو ایئر پورٹ پر چھوڑ دیا جائے اور اس چیکنگ سے جان چھڑائی جائے - ناگواریٔ طبع نے میرے مزاج کو برہم کردیا اور میں نے کسٹم افسروں سے خطاب کرکے کہا کہ میں اب یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ ہر چیز کو یہاں چھوڑ دوں - لہذا آپ جلد از جلد میری گلو خلاصی کریں اور اس ناروا رویہ کو ختم کریں -

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دونوں بچیوں کے سامان میں حبشی حلوے اور سوہن حلوے کے ایر ٹائیٹ ڈبے بھی ہیں - وہ بھی تحفے کے طور پر دینے کے لئے تھے - لیکن عملے کے لوگوں نے سمجھ لیا کہ ان میں ضرور قابل اعتراض چیز ہے - چنانچہ انہیں کھول کر سونگھا گیا - میری لڑکی نے بگڑ کر کہا کہ آپ چاہیں تو اسے چکھ سکتے ہیں - یہ زہر نہیں ہے اور نہ نشہ آور ہے - احتیاطاً ہمدرد کا تیار کردہ خمیرہ نزلی جواہر دار بھی ساتھ رکھ لیا تھا کہ شاید موسم کی اچانک تبدیلی کے باعث نزلہ زکام ہوجائے تو وہ کام آئے - اس کا بھی باقاعدہ معائنہ ہوا - غنیمت ہے کہ منتظمین نے اسے طبی دوا سمجھ لیا - وہ اسے بھی چرس کا مرکب کہدیتے تو ہمارے لئے کوئی ثبوت پیش کرنا مشکل تھا - اس سے قبل بھی ایسی چیزیں ساتھ جاتی رہی ہیں، لیکن کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی -

اگر میں اپنی پریشانی سے ہٹ کر صورت حال کو سمجھوں

تو ہوائی میدان کے عملہ' کسٹم کا رویہ غلط نہیں تھا۔ چرس وغیرہ کا کاروبار زوروں پر ہے اور اس میں پاکستان کے لوگ ملوث ہوکر بدنام ہوچکے ہیں۔ ہم بہر حال پاکستانی تھے اور کسٹم کے عملے کا درشت رویہ بے جا نہ تھا۔ ہر چند کہ سفارت پاکستان کے ایک افسر باہر موجود تھے، ان کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے حالات میں ایک اچھا سیاح وہ ہے کہ جو ایسا سامان ساتھ نہ رکھے جو کسی درجے میں بھی چرس وغیرہ سے مشابہ ہو۔

بارے سب کارروائی ختم ہوتے ہی ہم باہر نکل آئے۔ اگر عجلت نہ برتتے تو برن جانے والی ریل میں سوار ہونا مشکل ہوجاتا اور مزید تاخیر سے پروگرام میں اور بھی رخنہ پڑتا۔ اب ستم یہ ہوا کہ سڑکوں پر غیر معمولی بھیڑ تھی۔ موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ قریب ہی ایک اسٹور، جس میں لاکھوں کا سامان تھا، اچانک جل گیا۔ اس کا نیم سوختہ سامان کوڑیوں کے مول فروخت ہورہا تھا اور عوام اسے خریدنے کے لئے پل پڑے تھے۔ میں نے کہا، یا اللہ یہ حادثہ بھی آج ہی پیش آنا تھا! انسان کی یہ فطرت بھی کس درجہ عجیب ہے کہ کسی کا گھر جلے کوئی ہاتھ سینکے۔ میرے دل میں بڑی شدت کے ساتھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے ان لوگوں کے لئے جن کا سامان جلا تھا۔ یہ یقین تھا کہ سامان بیمہ شدہ ہوگا، مگر پھر بھی قومی نقصان تو ہوا۔

بارے ہم بہ مشکل ریلوے اسٹیشن تک پہنچے۔ گاڑی چھوٹنے میں صرف دس منٹ باقی تھے۔ ڈالر بھنانے، ٹکٹ خریدنے اور اندر جا کر ریل کے ڈبے میں اپنی سیٹیں سنبھالنے کے مرحلے پریشان کن تھے۔ لیکن ان تمام منزلوں سے مستعدی کے ساتھ گزرنا ضروری تھا۔ برن تک کے واپسی ٹکٹ تقریباً ایک ہزار

روپے کے تھے - مجھے پسینہ آگیا - قلی کو چھتیس فرانک دینے پڑے ، اور برن میں ہوٹل جا کر معلوم ہوا کہ دو کمروں کے لئے ایک سو بیس فرانک یومیہ ادا کرنے ہوں گے - کھانے اور ناشتے کا اس میں کوئی ذکر نہیں تھا -

## پروفیسر برگل

برن کے ریلوے اسٹیشن پر سفارت خانۂ پاکستان کے اسسٹنٹ سکریٹری صاحب تشریف لے آئے تھے - مگر میری آنکھیں پروفیسر برگل کو تلاش کر رہی تھیں اور بالآخر میں نے ان کو دیکھ لیا - ان کے لیے مجھے پہچاننا کون سا مشکل تھا - یہاں سفید شیروانی میں سوائے میرے اور کون ہوسکتا تھا !

ہم دونوں ملے اور بے اختیار گلے ملے - ایک دوسرے کو پیار کیا - برگل واقعی بڑے پیارے انسان ہیں - ان کی مدد سے سارا سامان اسٹیشن سے ہوٹل تک ڈھویا گیا - ہوٹل ریلوے اسٹیشن سے کافی دور تھا - سامان کمروں میں پہنچا کر اپنے ھاتھ دیکھے تو ان پر چھالے سے نظر آئے - میں نے کہا کہ یہ ھاتھ تو نبض دیکھنے کا ہے اور اس سے میں لکھتا بھی ہوں - اگر اس کو تکلیف پہنچی تو میں کیا کرونگا - کیا دونوں کام عارضی طور پر رک جائینگے - میں نے اپنے ھاتھ کو بوسہ دیا - بچیوں کو ذرا ڈانٹا کہ تم اتنا سامان کیوں ساتھ لائی ہو - بہتر یہ ہے کہ زائد از ضرورت اشیا کو یہیں تقسیم کردو تا کہ بوجھ ھلکا ہوجائے -

خانم ڈی سلوا ہر تکلیف نظر انداز کرچکی تھیں - ان کا بڑا بیٹا ٹیری ڈی سلوا ان کے ساتھ تھا - ماں نے چار سال کے بعد بیٹے کو دیکھا تھا - بیٹا تو اتنا قد آور ہوگیا ہے کہ ماں اس کے سامنے ” گرل فرینڈ ،، نظر آتی ہے - ٹیری ہمارے ساتھ ہے -

۸ بجے پروفیسر برگل اوران کی شریک حیات ہوٹل آگئے -

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں میرا یہ سفر انہی کی تحریک پر شروع ہوا تھا ۔ میں نے ۱۹۷۲ء میں ان کی تقریر کا اہتمام شام ہمدرد میں کیا تھا ۔ پھر ۱۹۷۳ء میں جب میں جنیوا پہنچا تو بطور خاص ان سے ملاقات کے لئے برن گیا تھا ۔ اس کے بعد کنگرس عالمی ابو ریحان البیرونی میں شرکت کے لئے انہیں پاکستان بلایا تھا ۔ وہ میرے مہمان رہے تھے ۔ وہ انتہائی دانا اور عاقل انسان ہیں ۔ مستشرق بھی ہیں ، لیکن تعصب نام کو نہیں ہے ۔ خالص علمی نظر سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں ۔

آج رات ڈنر کا انتظام پروفیسر مرسیئر کی جانب سے تھا ۔ اس میں مس ھان وتھیرچ بھی شریک تھیں جو میرے پروگرام کی نگراں تھیں ۔ پروفیسر باش بھی آئے جو ماہر نفسیات ہیں اور تہران یونیورسٹی میں چھے سال رہ چکے ہیں ۔ سات آٹھ آدمیوں کا یہ ڈنر محض علمی گفتگو کے لئے رکھا گیا تھا ۔ رات دس بجے تک نشست رہی ۔ اس بات چیت کا بہت دن تک دل و دماغ پر اثر رہا ۔

رات گیارہ بجے فراغت پا کر بستر پر لیٹا تو دن بھر کے حالات پر کچھ دیر غور کرتا رہا ۔ کتنا سخت دن تھا ۔ اللہ کا شکر ہے کہ خیریت کے ساتھ گزر گیا ۔

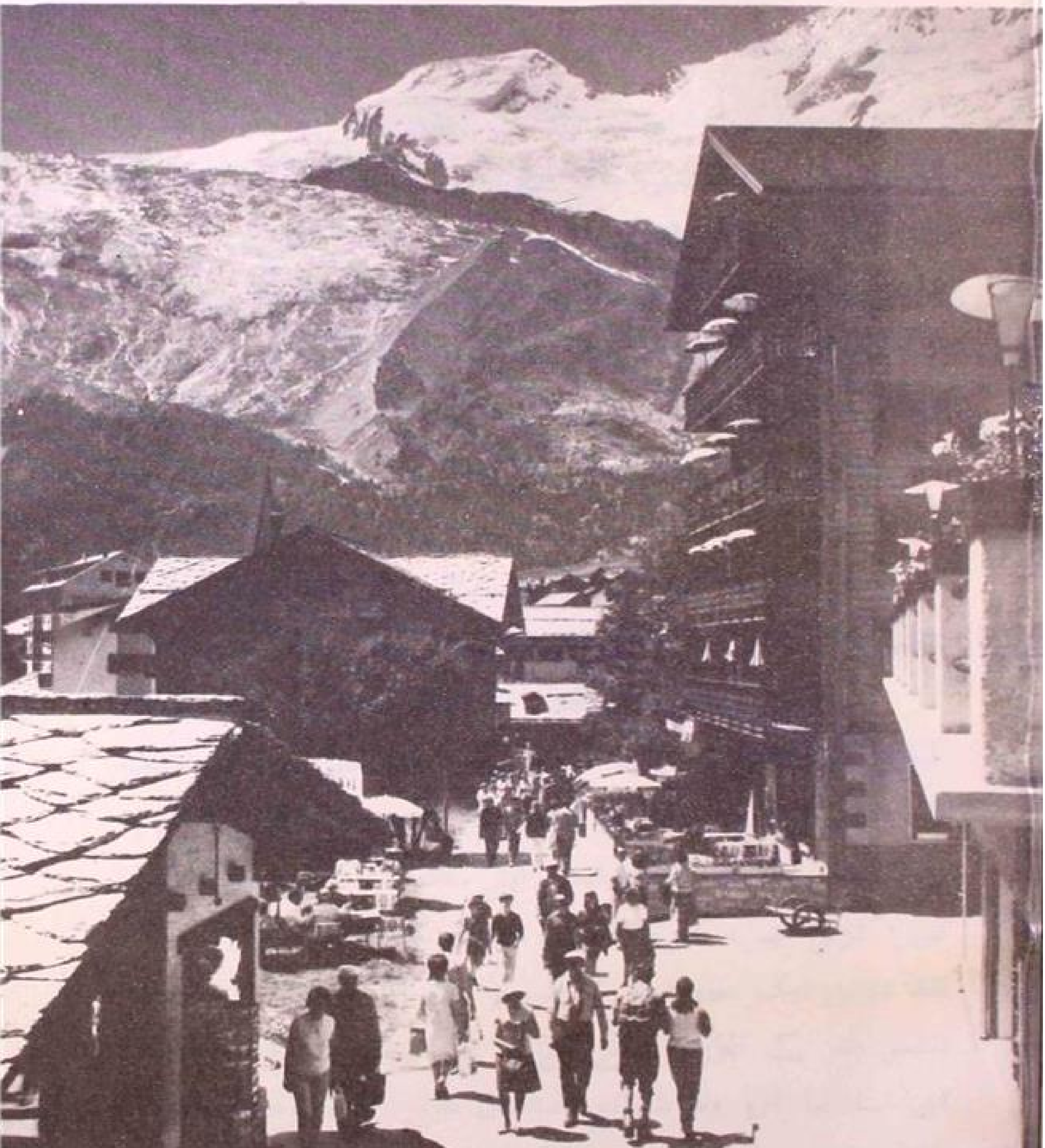
—: (٥) :—

# پہلی منزل

آج میں اور میرے ہم سفر صحیح معنوں میں سوئزر لینڈ یعنی منزل مقصود پر پہنچ چکے تھے ۔ میرے لئے تو نہیں میری ہم سفر خواتین کے لئے یہ اس سر زمین رنگ و بو پر پہلا قدم تھا اور ہم سب کی پہلی منزل تھی ۔

میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں بستر پر لیٹوں اور مطالعہ کے بغیر سوجاؤں ۔ یہ ایک پرانی عادت ہے ۔ میں اس کو ترک کرنا بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ بعض چیزیں مجھے بہرحال پڑھنی ہوتی ہیں اور اس کے لیے یہ موزوں ترین وقت ہوتا ہے ۔ سوئزر لینڈ کو سمجھنے کے لئے میں نے کافی میٹیریل اپنے ساتھ رکھا ہے ۔ میں نے اپنے بیگ سے کتب مطالعہ نکالیں اور ٹیبل لیمپ کے نیچے ان کو مرتب کردیا ۔ اور ایک کتاب اٹھائی کہ دیکھوں جس ملک میں اس وقت میں ہوں اس کا نام کیا ہے اور وہ کسطرح مرتب ہوا ۔

سوئزر لینڈ کا نام ذہن میں آتے ہی ایک ایسی سر زمین کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جس کا کچھ حصہ برف پوش پہاڑوں اور کچھ ایسے سبزہ زاروں پر مشتمل ہو جن پر نگاہ ڈالنے سے نہ صرف آنکھوں میں طراوت آتی ہو بلکہ بقول شاعر " جس کو دیکھ کر بڑھ جائے بینائی " ۔ یہ دریاؤں، جھیلوں اور پر فضا وادیوں کی سرزمین بھی ہے ۔ یہاں برف کے کئی کئی میل لمبے ایسے تودے بھی نظر آئیں گے کہ وہ سب پگھل جائیں تو نہ صرف اس ملک میں سیلاب آجائے بلکہ آس پاس کے دوسرے ممالک بھی متاثر ہو جائیں ۔



کینٹن ویلے اِس میں تعطیلات کی تفریح گاہ جہاں موٹر کاروں کی آمدورفت ممنوع ہے۔

## سوئزر لینڈ

یوں تو انگریزی زبان کے اعتبار سے اور جہاں جہاں انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے، اسے سوئزر لینڈ کہہ دیا جاتا ہے، لیکن یہاں کے باشندے اسے زیادہ تر شویز کہتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف زمانوں میں اسے مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اس کے نام کا سب سے پہلا حوالہ ۹۷۲ء کی ایک دستاویز میں ملتا ہے جو وہاں کے ایک شہنشاہ اوٹو دوم سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق ملک کا نام سوئی ٹیس تھا۔ تہتر سال بعد یعنی ۱۰۴۵ء کی ایک اور تحریر میں اسے سوائٹس کہا گیا ہے۔ اس کے بعد اس نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ مثلاً سوئٹس، شوئٹس اور شوئیسز وغیرہ۔

۱۷۵۸ء میں اس ملک کے ایک باشندے جان جیکب گیلاٹی کونسٹنس نے ایک کتاب مرتب کی جس میں اپنے ملک کا نام شوائزر لکھا۔ اس کی ایک شکل شویزر بھی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ متحد ریاستیں اپنے ملک کو اس نام سے موسوم نہیں کرتی تھیں، کیونکہ ۱۴۹۹ء کی جنگ سوابین کے وقت تک لفظ شویزر ایک ہجو قبیح کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور اس لئے دشمن طنز کے طور پر بولتے تھے۔ بعد میں خود ملک والوں نے اسے اپنا لیا اور وہ بتدریج استعمال ہونے لگا۔ آج تک یہ نام رائج ہے۔

تاریخ داں جوہانیز فان مُلّر پہلا شخص ہے جس نے شوائزر اور شویزر کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کیا۔ اس نے کہا کہ اس ملک کی متحد ریاستوں کو باشندوں سے ممتاز کرنے کے لئے دوسری اصطلاح ضروری سمجھی گئی ہے۔ تاہم ماہرین لسانیات پورے یقین کے ساتھ اس فرق کی وضاحت نہیں کرسکے ہیں۔

ایک انتہائی قدیم روایت کے مطابق اس کی افسانوی بنیاد اس لئے لفظ شوئزر پر ہے کہ شوائزر چند قبائل کا گروہ تھا جس کے افراد ابتدا میں سوئیڈن کے باشندے تھے۔ وہ اپنے وطن میں شدید قحط پڑنے کے باعث ترک وطن کرکے یہاں آئے اور بس یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ان سے قبل مقامی باشندے تعداد میں بہت کم اور ثقافتی اقدار سے بے بہرا تھے۔ ان کا وجود تاریخی لحاظ سے بالکل ”نہیں،، کے برابر تھا۔ ترک وطن کرنے والوں کا ایک بڑا قبیلہ اپنے دو سرداروں کی قیادت میں جھیل لیوسرن کے کنارے آباد ہوگیا۔ دونوں سردار آپس میں ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ ایک کا نام سوئٹ اور دوسرے کا ھئیے تھا۔ اقتدار کی ہوس ہر جگہ اپنا رنگ جماتی ہے۔ چنانچہ یہ دونوں بھائی بھی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس معرکہ میں بڑا بھائی جیت گیا جس کا نام سوئٹ تھا۔ اس نے اپنے نام کی رعایت سے ساری وادی کا نام شوائٹز رکھ دیا جو بعد میں شوائز ہوگیا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ یہ روایت عرصہٴ دراز کے بعد سینہ بہ سینہ عوام تک پہنچی ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ انسانی ذہن کا رنگ اس پر چڑھ گیا ہو اور حقیقت کچھ اور ہو۔

ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ ہل ویتیا قبیلے کے لوگ ولادت مسیحؑ سے بھی پانچ سو سال پہلے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان کی وجہ سے ایک بڑا علاقہ ”ہل ویتیا،، کہلانے لگا تھا۔ اب بھی اس لفظ کو سوئس کے ہم معنی اور ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ لفظ تحریر میں بھی رائج ہے۔ پوسٹ آفس ڈاک کے جو ٹکٹ چھاپتا ہے ان پر زیادہ تر ہل ویتیا ہی لکھا جاتا ہے۔

بعد کے ایک اور نقاد یوہان البرخ هب شمید نے، جو قدیم

اقوام اور قدیم زبانوں کے ماہر ہیں ، لفظ شونٹز کو ایک ایسے قدیم لفظ سے ملایا ہے جس کے معنی سؤر اور پہاڑ دونوں رائج تھے۔ انہوں نے موخرالذکر کو ترجیح دی ، کیونکہ یہ سارا علاقہ پہاڑی ہے۔ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ شاید یہ ایک قدیم قبیلے کے نام سے اخذ کیا گیا ہو جس کے افراد پہاڑی کی طرح قد آور اور قوی الجثہ ہوتے ہیں۔

ایک تیسرے نقاد سوئے ریگر نے ہند یورپی زبان کے مادے سے لفظ سوئیڈ نکالا جس سے لفظ شوائٹز بنا۔ اس کے دو مطلب ہیں " ایک جنگلی علاقے کا پر فضا مقام "، اور " وہ مقام جسے زراعت کے لئے جلا کر صاف کیا گیا ہو "

سولھویں صدی کے ایک مورخ ایگیدیس نشودی نے اپنی کتاب " مختلف آثار قدیمہ کی اصل تفہیم "، میں لکھا ہے کہ جب کسی ملک کی بہت سی ریاستیں متحد ہوجائیں تو ان کا مشترک نام اصطلاحی اعتبار سے شویزر رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ ۱۴۹۹ء کی جنگ سوابین تک شویزر کی اصطلاح مذموم انداز میں استھزا کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

بہر نوع اصلیت کچھ بھی ہو ملک کی قومی زبانوں میں سے تین یعنی جرمن ، فرانسیسی اور اطالوی میں اسے شوئیز، سوئس اور سویزیرا کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں ، جو قومی زبان تو نہیں ہے ، تاہم ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے ، اسے سوئٹزر لینڈ کہتے ہیں۔

## زبانیں

ذکر زبانوں کا آیا ہے تو یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں بیک وقت چار قومی زبانیں تسلیم کی گئی ہیں۔ لیکن ایک زبان بولنے والے کو دوسری زبان بولنے والے

سے کبھی کوئی عداوت نہیں ہوتی۔ میری رائے ہے کہ ان ملکوں کو جہاں ایک سے زائد زبانیں رائج ہوں، سوئزر لینڈ سے سبق لینا چاہیئے کہ محض زبان وجہ نزاع نہ بنے۔ وہاں ان زبانوں کے بولنے والوں میں کوئی ایسا علمی، سیاسی یا ثقافتی معاہدہ نہیں ہوا ہے کہ وہ آپس میں شیر و شکر ہوکر رہیں گے اور صرف لسانی مسئلے کو کسی جھگڑے کا سبب نہیں بنائیں گے۔

یورپ کے عین وسط میں چار زبانوں کا پر امن طور پر موجود ہونا نہ تو کسی معاہدے کا رھین منت ہے اور نہ کسی ایسے قانونی سمجھوتے کا نتیجہ ہے جس کو مختلف تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی حالات میں اختیار کیا جاسکتا ہو اور نہ اس مسئلے کے اس پہلو کو فراموش کیا جاسکتا ہے جو مختلف لسانی گروہوں میں ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس رویے میں اقلیت کا احترام بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر رواداری کا اصول ملک کے نظریات کا جزو لاینفک ہے۔

اس سرزمین پر بولی جانے والی چار قومی زبانیں — جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور رومانش ہیں۔ تاہم انگریزی، جسے قومی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہے، ہر جگہ آسانی سے سمجھی اور بولی جاسکتی ہے۔ جرمن زبان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس وقت ملک پچیس ضلعوں (ریاستوں) میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں سے انیس ضلعوں (ریاستوں) کے باشندوں کی اکثریت جرمن زبان بولتی اور سمجھتی ہے۔ ان میں ذریعۂ تعلیم بھی یہی زبان ہے۔ صرف پانچ ریاستوں یعنی فرائی برگ، ووڈ، ویلیس، نیوشیتل اور جنیوا میں فرانسیسی عام ہے۔ چنانچہ ان میں ذریعۂ تعلیم بھی فرانسیسی ہے۔ صرف ایک ریاست یعنی ٹسینو میں اکثریت کی زبان اطالوی ہے۔ تعلیم اسی زبان میں ہوتی ہے۔

رومانش کہیں کہیں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کوئی علاقہ اس کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اس لئے یہ کسی بھی ریاست میں ذریعہٗ تعلیم نہیں ہے۔ کئی لحاظ سے ہر ریاست کو اتنی آزادی ملی ہوئی ہے کہ اسے خود مختار ریاست کہا جاسکتا ہے۔

ریاستی لسانی حق کے اعتبار سے جس ریاست میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے وہاں وہی ایک زبان علاقائی اصول پر اس ریاست کی زبان ہوتی ہے۔ اس طرح وہی زبان سرکاری زبان بھی ہوتی ہے اور اس کو اسکولوں میں ذریعہٗ تعلیم بنایا جاتا ہے۔ البتہ فنی تربیت کے اداروں میں زیادہ تر جرمن یا فرانسیسی زبانوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔

۱۹۷۰ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ سارے ملک میں جرمن زبان بولنے والوں کی اوسط ۶۴ء۹ فی صد، فرانسیسی کی ۱۸ء۱ فی صد، اطالوی کی ۱۱ء۹ فی صد، رومانش کی ۰ء۸ فی صد تھی۔ اس کے علاوہ ۱ء۴ فی صد باشندے دوسری مختلف زبانیں بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اگر صرف سوئس نژاد باشندوں کو لیا جائے تو ان زبانوں کو بولنے والوں کی اوسط علی الترتیب ۷۴ء۵ فی صد، ۲۰ء۱ فی صد، چار فی صد، ایک فی صد اور اعشاریہ چار فی صد تھی۔ شروع میں صرف اول الزکر تین قومی زبانیں تھیں۔ تاہم ۸ جولائی ۱۹۳۷ء کو رومانش نے بھی قومی زبان کی حیثیت حاصل کرلی۔ اس وقت اسے بولنے والوں کی اکثریت صرف گراوٗبندن ریاست میں ہے۔ ان کی کل تعداد مشکل سے پچاس ہزار باشندے ہے۔

رومانش سے قطع نظر باقی تین زبانیں دفتری زبانیں بھی سمجھی جاتی ہیں۔ یعنی وفاقی کونسل کے اراکین یا سرکاری ملازمین ان تینوں میں سے جس زبان میں چاہیں اظہار خیال

کرسکتے ہیں یا ہدایات و احکامات دے سکتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی مسل کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس میں تینوں زبانوں کی تحریریں مختلف افسروں یا ماتحتوں کے قلم سے لکھی ہوئی نظر آسکتی ہیں۔ گویا اچھی طرح ایک زبان جاننے والے سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ وہ باقی دو زبانوں میں بھی لکھنے پڑھنے کی استعداد رکھتا ہے۔ جب مادری زبان کا سوال پیدا ہو تو ہر شخص صرف ایک ہی زبان لکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اس حقیقت کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو ہر مسل پر انگریزی، فارسی اور اردو لکھی جانے لگی تھی۔ اس شروع زمانے میں بھی انگریز فارسی اور اردو سمجھ لیتے تھے اور ملک کے بیشتر لوگوں کر انگریزی زبان کی شد بد ہوگئی تھی۔

باہر سے آنے والے ہمیشہ یہ دریافت کرتے ہیں کہ سوئزر لینڈ کی فوج میں کون سی زبان بولی جاتی ہے۔ عموماً قاعدہ یہ ہے کہ جس یونٹ سے واسطہ پڑتا ہے اس کے جوانوں کی جو بھی مادری زبان ہوتی ہے اس میں حکم دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فوجی یونٹ ایک زبان بولنے والوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جب کئی زبانیں بولنے والے اکٹھے ہو جائیں تو پھر احکامات کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ بہت اہم نوعیت کے قواعد اور قوانین کو تینوں سرکاری زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔ افسروں کو جہاں کئی زبانوں میں تربیت دی جاتی ہے وہاں اتالیق اور طلبہ عموماً اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو دوسری زبانوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

سوئزر لینڈ میں جرمن زبان بولنے والے ہر باشندے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی روزمرہ کی بول چال

میں سوئز جرمن زبان بولتا ہے بلکہ اپنی ریاست کی پارلیمان میں ، عام جلسوں میں اور کبھی کبھی گرجا گھر میں بھی فرائض مذہبی ادا کرتے وقت یہی زبان بولتا ہے ۔ بچوں کی لسانی صلاحیت کے پیش نظر سوچا جائے تو جرمن زبان ان کے لئے ایک غیر ملکی زبان ہے ۔ تاہم اس میں استعداد حاصل کرنے کے لئے بہت ہی آسان طریقے اختیار کئے گئے ہیں ۔

## لسانی تبدیلی

اس زمانے میں ملک کے لسانی ڈھانچے میں ایک تبدیلی بڑی تیزی سے رونما ہورہی ہے ، کیونکہ معاشی توسیع پسندی کی بنا پر ملک کے اندر آبادی کی نقل و حرکت بہت بڑھ گئی ہے ۔ وسطی سطح مرتفع کے علاقے میں یہ بات خاص طور سے نمایاں ہے ۔ اس نقل و حرکت کی وجہ سے بعض بڑے شہروں میں لسانی اقلیتیں ظہور میں آرہی ہیں ۔ گزشتہ چند سال میں فرانسیسی بولنے والے سوئس باشندوں نے زیورخ ، برن اور بازل میں سکونت اختیار کرلی ہے ۔ ٹسینو سے اطالوی زبان بولنے والوں نے اور گریسنز سے رومانش بولنے والوں نے کوہ ایلپس کے شمال میں سکونت اختیار کرنی شروع کردی ہے ، خصوصاً اس لئے بھی کہ وہاں ملازمت یا روزگار حاصل کرنے کے مواقع بہتر ہیں ۔ پھر بھی اس معاشی سرگرمی کے ساتھ جو خصوصیت وابستہ ہے اسے ملک کے لسانی ڈھانچے کو پرکھنے کا معیار قرار نہیں دیا جاسکتا ۔

## دیسی زبان

جیسا کہ اوپر میں نے بتایا ہے سوئزر لینڈ کے عام باشندے اپنی روزمرہ کی بول چال میں سوئز جرمن زبان بولتے ہیں جسے ایک لحاظ سے دیسی زبان کہا جاتا ہے ، کیونکہ اس میں بہت سی

مقامی بولیاں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ وہ اعلا جرمن زبان ، جو کہ جرمنی میں بولی جاتی ہے ، صرف لکھنے میں استعمال ہوتی ہے۔ اس میں کتابیں بھی چھپتی ہیں۔ اس کو خبر رسانی اور اطلاعات کے ذرائع میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اعلا جرمن زبان کے بہت سے الفاظ عام بول چال میں استعمال کرتے ہوئے لوگ ھچکچاتے ہیں۔ زبان کا یہ دوھراپن کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں نے کوشش کی کہ دیسی زبان کو دیسی علاقوں اورکم تعلیم یافتہ طبقوں تک محدود رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے ریڈیو کا ایک پروگرام شروع کیا گیا جس میں میزبان خاتون ٹھیٹھ دیسی زبان بولتی اور پروگرام کے دوسرے شرکاؑ اعلا جرمن زبان استعمال کرتے۔ وہ خاتون نہایت ثقیل موضوعات کے لئے بھی اپنی دیسی زبان پر ڈٹی رہتی ، حالانکہ وہ اعلا جرمن زبان خوب جانتی تھی۔ یہ پروگرام کچھ زیادہ مقبول نہ ہوسکا اور آخر کار ترک کردینا پڑا۔ تاہم ریڈیو اور ٹیلے وژن سے عام استعمال کی چیزوں کے جو اشتہارات نشر ہوتے ہیں ان میں دیسی زبان برابر استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے زیادہ عام فہم سمجھا جاتا ہے۔ عوامی جلسوں میں ، جہاں ہر خاص و عام کو شرکت کی اجازت ہوتی ہے ، زیادہ تر دیسی زبان استعمال کی جاتی ہے۔

موجودہ صدی کے شروع میں جب شمالی اور وسطی سوئزر لینڈ میں اعلا جرمن زبان اپنا رعب جمانے لگی تو دیسی زبان کو معاشرتی اور جغرافیائی سرحدی علاقوں سے جلا وطن کر دینا چاہا لیکن چونکہ شدید لسانی وطن پرستی کے جذبے نے اس کی جڑیں مضبوط کر رکھی تھیں اس لئے اسے کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔ بلکہ دیسی جرمن زبان کو ایک قومی زبان سمجھنے کا رجحان بڑھتا

گیا - حالانکه اس روزمرہ کی دیسی زبان میں یکسانیت نہیں تھی - مثلاً جھیل زیورخ کے ملاح جب آپس میں باتیں کرتے تو ان کی اصطلاحات ان لوگوں کی زبان سے مختلف ہوتی تھیں جو شہروں اور دیہات کی منڈیوں میں استعمال ہوتی تھیں - لیکن ایک قدرتی لچک ہونے کے باعث اسے ہر جگہ سمجھ لیا جاتا تھا اور اب بھی یہی حال ہے - البتہ کشتیوں پر کام کرنے والے ملاح جب ترقی پا کر بڑے جہازوں پر کپتان یا انجنیئر کہلانے لگتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے - اور اب جدید ٹکنالوجی اور خلائی سفر نے جو نئی اصطلاحات پیدا کی ہیں ، ان کے باعث بھی لسانی تغیر رونما ہو چلا ہے جو اعلا مصنفین کی تحریروں ہی میں نہیں عام بول چال میں بھی سرایت کر چلا ہے - صرف دور افتادہ وادیاں اور قصبات ان اثرات سے بچے ہوئے ہیں - وہاں محاوروں کے اختلافات مقامی حالات اور رسومات کے زیر اثر پروان چڑھتے ہیں - اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ دیسی زبان کبھی بھی مٹ سکیگی -

—:(۵):—

میرے ہم سفروں میں سے صرف خانم ڈی سلوا فرانسیسی زبان جانتی ہیں - باقی دونوں لڑکیاں اور میں ایک غیر ملک میں رہتے ہوئے صرف انگریزی میں بات چیت کرسکتے ہیں - ہم تین میں سے کسی کو بھی نہ تو سخت گیر آمر جرمنی ہٹلر کی زبان آتی ہے اور نہ حسن پرست شاعر اطالیہ دانتے کی زبان سے واقفیت ہے - رومانش کا تو ذکر ہی خارج از بحث ہے - مجھے یہ اطمینان تھا کہ اگر کہیں انگریزی زبان سے نا واقف کسی شخص سے بات چیت کا واسطہ پڑگیا تو خانم موصوفہ ہماری "زبان گیری" کے لئے تیار رہینگی - کیونکہ وہاں فرانسیسی بھی عام طور پر سمجھی جاتی ہے -

## مذاهب

ملک میں بولی جانے والی چار زبانوں کی طرح مذہبی عقائد رکھنے والوں کی اقسام بھی چار کہی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ بعض مفکرین نے تمام باشندوں کو صرف دو مذاہب میں تقسیم کیا ہے یعنی عیسائی اور یہودی لیکن عیسائیوں کے فرقے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کو الگ الگ سمجھنا اور شمار کرنا ہی مناسب ہے۔ ان میں سے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کی تعداد اکثر برابر رہتی ہے یا بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً یکم دسمبر ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق رومن کیتھولک افراد کی تعداد تیس لاکھ ستانوے ہزار یعنی کل آبادی کا ۴ء۴۹ فی صد تھی۔ جبکہ پروٹسٹنٹ انتیس لاکھ بانوے ہزار یا ۴ء۴۷ فی صد تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے مذاہب والوں کی تعداد ایک لاکھ اکیاسی ہزار یا ۲ء۹ فی صد تھی۔ دس سال قبل پروٹسٹنٹ دس ریاستوں میں اکثریت میں تھے اور بارہ ریاستوں میں کیتھولک کی اکثریت تھی۔ رومن کیتھولک چھ پادریوں کے ماتحت اور وہ سب ہولی سی یعنی پاپائے اعظم کے ماتحت ہیں۔

۱۹۷۴ء میں حالات بدلے تو اس تناسب میں تھوڑا سا فرق پیدا ہوگیا۔ یعنی پروٹسٹنٹ پچپن فی صد، رومن کیتھولک تینتالیس فی صد اور قدیم کیتھولک صرف ۴ء۰ فی صد رہ گئے یعنی موخرالذکر نے اپنی حیثیت الگ کرلی۔ ان کے علاوہ یہودیوں کی تعداد برائے نام یعنی ۲ء۰ فی صد رہ گئی۔ باقی عقائد رکھنے والوں کا تناسب ان سے زیادہ یعنی ۴ء۱ فی صد تھا۔ قدیم کیتھولک نے اپنے تشخص کو علاحدہ حیثیت دینے کے لئے احتجاج کیا اور برن یونیورسٹی میں اپنی دینیات کا الگ شعبہ قائم کرالیا۔ باقی عقائد رکھنے والوں میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ ان کی



شہر برن کا جدید حصّہ جس میں دو گرجا گھر نمایاں ہیں۔ پارک کے قریب سے دریا بہتا ہے۔

تعداد یہودیوں سے کچھ زیادہ ہی ہے ۔ ان سب سے قطع نظر ملک میں ایسے افراد کی تعداد بھی خاصی ہے جو کسی مذہب کے پیرو نہیں بلکہ لادین ہیں ۔ وہ نہ خدا کو مانتے ہیں ، نہ کسی پیغمبر کو ۔ ان پر روس کے عقائد اشتراکیت کا گہرا اثر ہے ۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف اپنی زبان سے نہیں کرتے لیکن ان کے عملی اقدامات اس کا بین ثبوت ہیں ۔ اس قسم کی دہریت اس وقت ساری دنیا میں پھیل رہی ہے جس کا تصور کرکے افسوس ہوتا ہے ۔

اپنی اس منزل سے آگے بڑھنے سے قبل میں نے مناسب سمجھا کہ ملک کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کا ایک سر سری جائزہ لے لیا جائے تاکہ بعض دوسرے حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے ۔ اور اگر ممکن ہو تو دستورالعمل اور طرز حکومت کو بھی ملحوظ رکھا جائے ۔

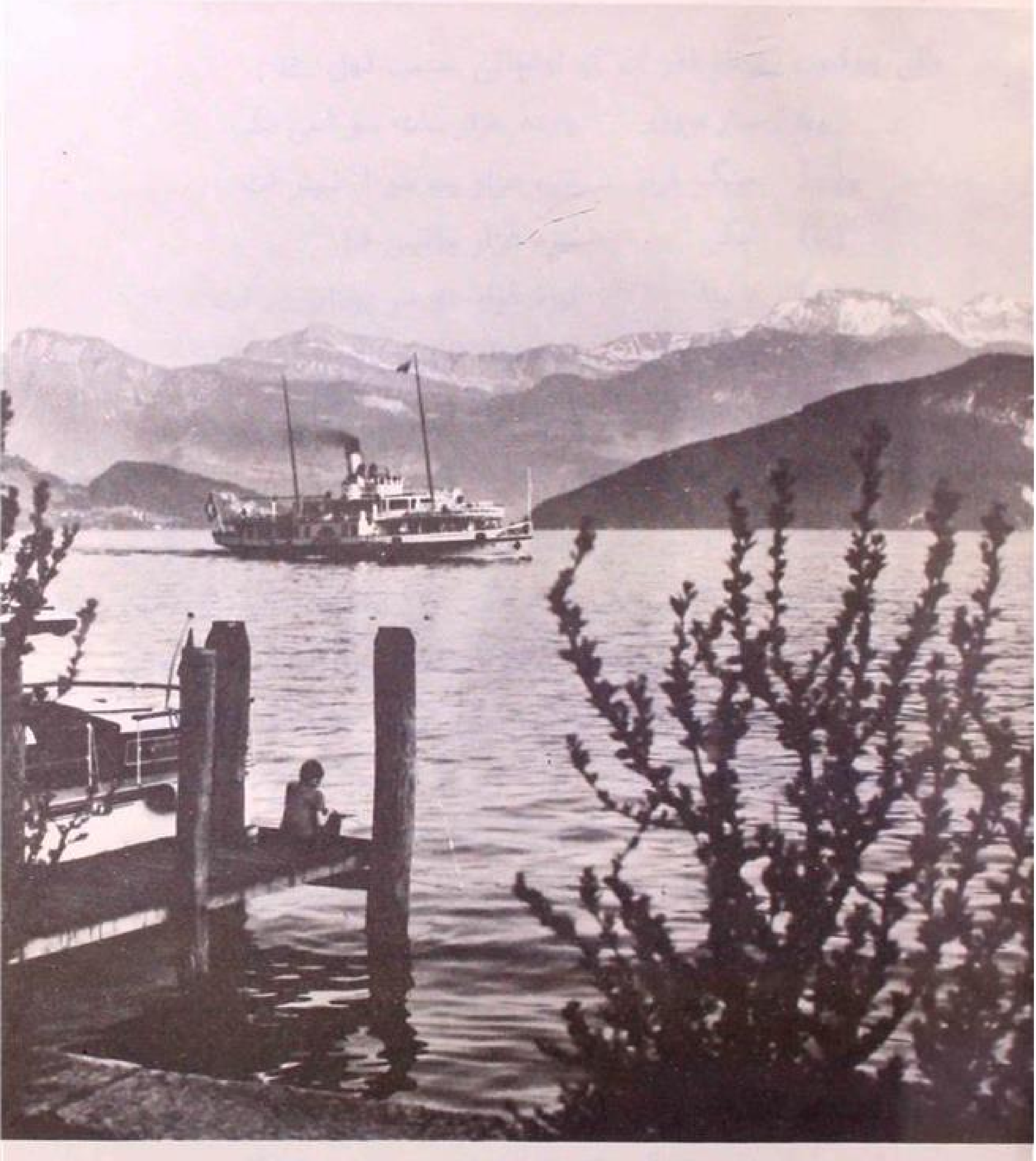
## جغرافیائی حالات

سوئزر لینڈ کو صحیح معنوں میں قلب یورپ کہا جاتا ہے ۔ اس کی دھڑکن براعظم کے ہر ملک میں سنائی دیتی ہے ۔ اس کے مغرب اور جنوب میں فرانس واقع ہے ۔ اس طرف سلسلۂ کوہ جورا اور جھیل جنیوا سرحد کا کام دیتے ہیں ۔ جانب شمال دریائے رھائن اسے جرمنی سے الگ کرتا ہے ۔ اس سرحد پر جھیل کونسٹنس کو بھی اہمیت حاصل ہے ۔ آسٹریا اور لیخ ٹن اسٹین اس کے مشرقی پڑوسی ہیں ۔ جنوب اور جنوب مشرق کی سمت کوہ ایلپس اور جھیل لگانو نے اسے اٹلی سے جدا کر رکھا ہے ۔ ملک کا نصف سے زیادہ حصہ پہاڑی ہے جو کچھ زیادہ بنجر اور سنگلاخ نہیں ہے بلکہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے ۔ باقی میدانی حصہ بھی سر سبز و شاداب ہے ، کیونکہ جھیلوں ، دریاؤں اور نہروں کی فراوانی نے قدرت کے دامن نشو و نما کو وسیع کردیا ہے ۔

یہاں کی آب و ہوا پر سارے یورپ کے موسمیاتی حالات کا اثر پڑتا ہے اور ملک کی پہاڑی ہیئت کی وجہ سے ہوا کا دباؤ اور موسم بڑی تیزی سے بدلتا ہے۔ ترسیب یا نمی کا تناسب کافی فرق ڈالتا ہے۔ جنوبی سمت سے چلنے والی ہوائیں کوہ ایلپس کے شمالی حصے میں موسم کو ایک دم الٹ دیتی ہیں یعنی وہ معتدل ہو جاتا ہے جسے ملی باشندے اور سیاح بہت ہی خوشگوار سمجھتے ہیں۔ ایسی آب و ہوا میں بالیدگی، زرخیزی اور نشو و نما کی کیفیات بڑھ جاتی ہیں جو ہر لحاظ سے اس ملک کے لئے بڑی نعمت ہیں۔

ملک کا کل رقبہ اکتالیس ہزار دو سو تیرانوے مربع کلو میٹر یا پندرہ ہزار نو سو اکتالیس مربع میل ہے۔ شرقاً غرباً سب سے طویل حصہ دو سو چھبیس میل اور شمالاً جنوباً ایک سو سینتیس میل ہے۔ کل رقبے میں سے ۶٫۶ فی صد میں مختلف اناجوں کے کھیت ہیں یا انگور کی کاشت ہوتی ہے جو یہاں کی سب سے بڑی فصل ہے۔ ۱۹٫۹ فی صد میں گھاس کے قطعات ہیں جو سیرو تفریح کے لئے مخصوص ہیں۔ ۲۶٫۱ فی صد میں پہاڑی چراگاہیں ہیں جو بھیڑ بکریوں اور دوسرے مویشیوں کے لئے نعمت ہیں۔ ۲۳٫۸ فی صد میں جنگلات ہیں جن سے ایندھن اور عمارتی لکڑی، جو فرنیچر کے کام بھی آسکتی ہے، بڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔ ۲۳٫۶ فی صد حصے میں رہائشی مکانات اور دوسری عمارتیں ہیں۔

پہاڑی علاقے میں سب سے اونچی چوٹی سطح سمندر سے پندرہ ہزار دو سو فیٹ ہے جو کہ ڈوفور سپٹز کہلاتی ہے۔ اسے فونٹے روزا بھی کہتے ہیں۔ سب سے نیچی پہاڑی جو سطح سمندر سے صرف ساڑھے چھے سو فیٹ بلند ہے لاگو میگور کہلاتی ہے۔



جہاز رانی کے قابل جھیل لیوسرن کے کنارے مچھلی کی شکار گاہ اور پس منظر میں سلسلۂ کوہ۔

باقی چوٹیوں کے نام اور ان کی اونچائی حسب ذیل ہے :

| | | |
|---|---|---|
| (۱) | میٹرھوون | چودہ ھزار سات سو اسی فٹ |
| (۲) | جنگ فراؤ | تیرہ ھزار چھ سو اکہتر فٹ |
| (۳) | ایگر | تیرہ ھزار چالیس فٹ |
| (۴) | برنینا | تیرہ ھزار دو سو پچیانوے فٹ |
| (۵) | ریگی | تین ھزار نو سو پانچ فٹ |
| (٦) | چیسیرال | پانچ ھزار تین سو فٹ |

## برفانی تودے ، جھیلیں

عام پہاڑوں سے ملتے جلتے برفانی تودے بھی اس سر زمین پر پائے جاتے ھیں - سب سے بڑا برفانی تودا پینسٹھ مربع میل میں پھیلا ھوا ھے جو عظیم ایلٹس کہلاتا ھے - پہاڑوں کی طرح بعض جھیلیں بھی وسیع رقبے میں پھیلی ھوئی ھیں - سب سے بڑی جھیل تو جھیل جنیوا ھے جس کا رقبہ دو سو چوبیس مربع میل ھے - اس کے علاوہ جھیل کونسٹنس کا رقبہ دو سو سات مربع میل ، جھیل نیوشیتل کا رقبہ تیراسی مربع میل ، لاگومیکیور کا رقبہ بیاسی مربع میل اور جھیل لیوسرن کا رقبہ چوالیس مربع میل ھے۔ چھوٹی بڑی اور بہت سی جھیلیں ملک بھر میں جگہ جگہ پائی جاتی ھیں ، جو موسم کے اعتبار سے ھر سال وجود میں آتی اور پھر ختم ھو جاتی ھیں - ان کے علاوہ پچاس سے زیادہ مصنوعی جھیلیں ھیں جو برق آبی کے کارخانوں کے لئے بنائی گئی ھیں - اس طرح مجموعی طور پر تمام جھیلوں کی تعداد چودہ سو کے قریب ھے -

پہاڑوں کے علاوہ مذکورہ بالا بڑی جھیلوں سے بھی کئی دریا نکلتے ھیں اور کئی دریا پہاڑوں سے اتر کر جھیلوں میں مل جاتے ھیں - گویا سارے ملک میں دریاؤں اور جھیلوں کا

ایک جال سا بچھا ہوا ہے ۔ مجموعی طور پر سب پہاڑوں اور جھیلوں کا اڑسٹھ فی صد پانی دریائے رھون کے ذریعے بحیرہ شمالی میں ، اٹھارہ فی صد حصہ دریائے رھون کے ذریعہ بحیرہ قلزم میں ، دس فی صد حصہ دریائے ٹسینو کے ذریعے بحیرہ ایڈریاٹک میں اور صرف چار فی صد حصہ دریائے ان کے ذریعے بحیرہ اسود میں جا گرتا ہے ۔ ان سمندروں کی موجودگی سے بھی ملک کے محل وقوع کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کس درجہ منفرد ہے ۔

## آبادی

نسلی ، لسانی ، مذہبی ، ثقافتی اور رواجی اعتبار سے ملک کی آبادی ، جو مجموعی طور سے باسٹھ لاکھ سے زیادہ ہے ، مختلف النوع کہی جاسکتی ہے ۔ کہیں بے حد گنجان ہے اور کہیں بالکل چھدری ہے ۔ کہیں ایک عقیدے کے لوگ اکثریت میں ہیں تو کہیں دوسرے عقیدے کے ۔ اس آبادی میں غیر ملکی باشندوں کی تعداد تقریباً ساڑھے نو لاکھ ہے اور تین لاکھ کے قریب اس ملک کے باشندے دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں ۔

جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جاچکا ہے سارا ملک پچیس ریاستوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو بیک وقت نہیں بلکہ مختلف زمانوں میں مرکزی وفاق میں شامل ہوئے تھے ۔ ان ریاستوں کا رقبہ ، وفاق میں ان کی شمولیت کا سنہ ، یکم دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہر ایک کی آبادی اور ہر ریاست کی فی کلو میٹر آبادی کا کچھ اندازہ اعداد و شمار کے اگلے صفحے کے جدول سے لگایا جاسکتا ہے :



کوہِ ایلپس کی چوٹی سَر کرنے والے سیّاح مرد اور عورتیں۔

(بائیں طرف) پہاڑ کی چوٹی تک لے جانے والا گائڈ۔

| ریاست کا نام | شمولیت | رقبہ کلو میٹر میں | کل آبادی | آبادی فی مربع کلو میٹر |
|---|---|---|---|---|
| زیورخ | ۱۳۵۱ء | ۱,۷۲۹ | ۱۱,۰۷,۷۸۸ | ۶۴۱ |
| برن | ۱۳۵۳ء | ۶,۸۸۷ | ۹,۸۳,۲۹۶ | ۱۴۳ |
| لیوسرن | ۱۳۳۲ء | ۱,۴۹۴ | ۲,۸۹,۶۴۱ | ۱۹۴ |
| اوری | ۱۲۹۱ء | ۱,۰۷۵ | ۳۴,۰۹۱ | ۳۲ |
| شوائز | ۱۲۹۱ء | ۹۰۸ | ۹۲,۰۷۲ | ۱۰۱ |
| اوب والڈن | ۱۲۹۱ء | ۴۹۲ | ۲۴,۵۰۹ | ۵۰ |
| نڈ والڈن | ۱۲۹۱ء | ۲۷۴ | ۲۵,۶۳۴ | ۵۴ |
| گلارس | ۱۳۵۲ء | ۶۸۴ | ۳۸,۱۵۵ | ۵۶ |
| زوگ | ۱۳۵۲ء | ۲۳۹ | ۶۷,۹۹۶ | ۲۸۵ |
| فرائی برگ | ۱۴۸۱ء | ۱,۶۷۰ | ۱,۸۰,۳۰۹ | ۱۰۸ |
| سولوتھرن | ۱۴۸۱ء | ۷۹۱ | ۲,۲۴,۱۳۳ | ۲۸۳ |
| بازل اسٹاڈ | ۱۵۰۱ء | ۳۷ | ۳,۳۴,۹۴۵ | ۶,۳۳۸ |
| بازل لینڈ | ۱۵۰۱ء | ۴۲۸ | ۲,۰۴,۸۸۹ | ۴۷۹ |
| شاف ہوسن | ۱۵۱۰ء | ۲۹۸ | ۷۲,۸۵۴ | ۲۴۴ |
| اپین زل الف | ۱۵۱۳ء | ۲۴۳ | ۴۹,۰۲۳ | ۳۰۲ |
| اپین زل ا | ۱۵۱۳ء | ۱۷۲ | ۱۳,۱۲۴ | ۷۶ |
| سنٹ گیلن | ۱۸۰۳ء | ۲,۰۱۶ | ۳,۸۴,۴۷۵ | ۱۹۱ |
| گراؤ بنڈن | ۱۸۰۳ء | ۷,۱۰۹ | ۱,۶۲,۰۸۶ | ۲۳ |
| آرگاؤ | ۱۸۰۳ء | ۱,۴۰۴ | ۴,۳۳,۲۸۴ | ۳۰۹ |
| تھرگاؤ | ۱۸۰۳ء | ۱,۰۰۶ | ۱,۸۲,۸۳۵ | ۱۸۲ |
| ٹسینو | ۱۸۰۳ء | ۲,۸۱۱ | ۲,۴۵,۴۵۸ | ۸۷ |
| وؤد | ۱۸۰۳ء | ۳,۲۱۱ | ۵,۱۱,۸۵۱ | ۱۵۹ |
| ویلئیس | ۱۸۱۵ء | ۵,۲۳۱ | ۲,۰۶,۵۶۳ | ۳۹ |
| نیو شیتل | ۱۸۱۵ء | ۷۹۷ | ۱,۶۹,۱۷۳ | ۲۱۲ |
| جنیوا | ۱۸۱۵ء | ۲۷۲ | ۳,۳۱,۵۹۹ | ۱,۱۷۵ |
| کل میزان | —— | ۴۱,۲۸۸ | ۶۲,۶۹,۷۸۳ | ۱۵۲ |

آبادی کے اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ زندگی اور موت ، شادی بیاہ اور طلاقوں کے اعداد و شمار پر نظر ڈالنا بھی دلچسپ حقائق سامنے لاتا ہے۔ یورپ کے اور ملکوں کی طرح سوئزرلینڈ میں بھی مردہ بچوں اور ناجائز بچوں کے اعداد و شمار بھی الگ جمع کئے جاتے ہیں ۔ چنانچہ تین تقویمی برسوں کی تفصیلات اس اعتبار سے حسب ذیل ہیں :

| سنہ | کل پیدائش | ناجائز بچے | مردہ بچے | شادیاں | طلاقیں | اموات |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱۹۷۳ء | ۸۷,۵۱۸ | ۳,۳۳۱ | ۶۶۵ | ۴۰,۷۶۸ | ۸,۱۳۰ | ۵۶,۹۹۰ |
| ۱۹۷۴ء | ۸۴,۵۰۷ | ۳,۰۸۸ | ۶۰۳ | ۳۸,۴۹۹ | ۸,۱۹۳ | ۵۶,۴۰۳ |
| ۱۹۷۵ء | ۷۸,۴۶۴ | ۲,۹۲۷ | ۵۶۶ | ۳۵,۱۸۹ | ۸,۹۱۷ | ۵۵,۹۲۴ |

ان اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ کل پیدائش کے ساتھ نا جائز اور مردہ بچوں کی تعداد برابر گھٹتی رہی ہے ۔ اسی طرح مرنے والوں کی تعداد بھی برابر گھٹتی رہی ہے۔ لیکن شادیوں کی تعداد کے مقابلے میں طلاقوں کی تعداد بڑھی ہے ۔ گویا صرف ایک محاذ پر اضافہ ہوا ہے ۔

پیشوں کے اعتبار سے باشندگان ملک کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں کی طرح سوئزر لینڈ میں بھی ان کی تقسیم انہی جیسی ہے ۔ یعنی سب سے بڑے حلقے میں وہ لوگ آتے ہیں جو زراعت ، باغبانی اور جنگلات کے انتظامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے حلقے میں صنعت و حرفت، تجارت ، کاروبار ، تعمیرات ، برقی قوت اور توانائی سے تعلق رکھنے والے شامل ہوتے ہیں ۔ ان کے بعد تیسرا حلقہ وہ ہے جس میں



بجلی کے تاروں سے چلنے والی چھینکا نما گاڑیاں جو کوہِ ایلپس کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک
سیاحوں کو سفر کراتی ہیں۔

سرکاری محکموں اور انتظامی اداروں سے تعلق رکھنے والوں کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ دریاؤں اور اونچے پہاڑوں کی سر زمین ہے، اسلیے قدرتی طور پر یہاں بارش اور برف باری زیادہ ہوتی ہے۔ لہذا سال کے بیشتر حصے میں موسم سرد رہتا ہے۔ ہوا میں رطوبت کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سردی خشک نوعیت کی نہیں ہوتی۔ یہاں کے موسمی حالات کا اثر قریب کے ملکوں پر اور قریبی علاقوں کا اثر یہاں پڑتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کوہ مری پر برفباری یا بارش ہو تو لاہور تک اور کوئٹہ میں برفباری یا بارش ہو تو کراچی تک موسم ایک دم بدل جاتا ہے۔ گرم ہوائیں بھی اسی طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

## تاریخی حالات

جہاں تک ملک کی تاریخ کا تعلق ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط تک کے حالات زیادہ واضح نہیں ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ مختلف علاقوں میں مختلف قبائل آباد تھے۔ پہاڑی سطح ہونے کے باعث آمد و رفت اور حمل و نقل کی سہولتیں ناپید تھیں۔ اس لئے عام باشندے آپس میں بہت کم ملتے جلتے تھے۔

یکم اگست ۱۲۹۱ء کو اوری، شوائز اور انٹر والڈن میں رہنے والے قبائلی باشندوں کو خیال آیا کہ اپنے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ ہم متحد ہوکر ایک دفاعی انجمن کی بنیاد رکھیں تا کہ آس پاس کے دوسرے قبیلے وقتاً فوقتاً حملہ آور ہو کر زندگی کا سکون درھم برھم نہ کر سکیں۔ اس انجمن کے دستور العمل کے مطابق ہر ریاست کو، جو اتحاد میں شامل ہوئی تھی، یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنی اپنی عدالت، امداد باھمی کے ادارے اور

اجتماعی تحفظ کے مراکز قائم کرلے ۔ اس معاہدے کی واحد دستاویز تیار کی گئی تھی جو اب بھی شوائز میں رکھی ہے ۔ اس اتحاد کا نتیجہ تھا کہ شامل ہونے والی ریاستیں بڑے بڑے جاگیر داروں کی ذاتی افواج کے مقابلے میں ڈٹ گئیں ۔ اس انجمن کے قیام نے گویا مستقبل کے جدید سوئزر لینڈ کی بنیاد رکھ دی اور پھر وہ انجمن اتفاق رائے سے ایک حکومت میں بدل گئی ، جسنے باقاعدہ ایک نظام کی صورت اختیار کر لی ۔ لیکن آس پاس کے دوسرے قبائلی علاقوں کو یہ بات اکھری اور وہ ان تین ریاستوں کے الحاق کو ختم کرنے کے درپے ہوگئے ۔ چنانچہ ۱۳۱۵ء سے ۱۵۱۳ء تک خوب نبرد آزمائی ہوتی رہی ۔ ابتدا ''جنگ برائے امن،، کے نام پر ہوئی تا کہ ہر ریاست کی آزادی برقرار رہ سکے ، لیکن بعد میں حقیقتاً قیام امن کے منصوبے تیار ہونے لگے ۔ یکے بعد دیگرے قریب کی دس ریاستیں مذکورہ بالا تین ریاستوں کے وفاق میں شامل ہوتی گئیں ۔ ان ریاستوں کے نام یہ ہیں :

(۱) لیوسرن (۲) زیورخ (۳) گلارس (۴) زوگ (۵) برن (۶) فرائی برگ (۷) سولوتھون (۸) بازل (۹) شاف ھوسن اور (۱۰) ایپن زل ۔

اس وفاق نے استقامت حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ رائج الوقت تقاضوں کی روشنی میں نئے انداز پر اصلاحات سے کام لیا جائے اور ایک پارلیمنٹ قائم کرلی جائے ۔ ان سب ریاستوں نے غیر جانبداریت کا اظہار کردیا تھا ۔ مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی دو ریاستیں آپس میں مل کر دوسروں کے خلاف محاذ قائم نہیں کرینگی ۔ چنانچہ ایک سو سال سے زیادہ عرصے تک امن وآشتی کی فضا قائم رہی ۔

۱۷۸۹ء میں فرانس نے اس سرزمین کی طرف قدم بڑھائے

اور چونکہ یہاں کی سب ریاستیں آزاد اور غیر جانبدار ہونے کے باعث اس اعتبار سے متحد نہیں تھیں کہ وہ کسی بیرونی حملے کا مشترکہ طور پر مقابلہ کرتیں ، اس لئے زچ ہوکر رہ گئیں اور فرانس نے اس سر زمین پر غلبہ حاصل کرلیا ۔ اس نے '' پھوٹ ڈلواؤ اور حکومت کرو ،، کے اصول پر بھی عمل کیا اور ملک کی کئی ریاستوں کو ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کے لئے اکسایا اور اس طرح اپنا مفاد پورا کرلیا ۔

۱۸۰۳ء میں نپولین بونا پارٹ نے پوری طرح یہاں قدم جمانے کے لئے ایک مسودۂ مصالحت پیش کیا اور کوشش کی کہ ایک نیا دستور العمل تیار کیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے ملک کے علاوہ آسٹریا ، برطانیہ ، پرتگال ، پروشیا ، روس ، ھسپانیہ اور سوئیڈن سے ضمانت دلوائی کہ علاقائی سالمیت میں کوئی فرق نہیں آئیگا ۔ لیکن وطن پرستوں نے اس ضمن میں کوئی مفاھمت نہیں کی اور اپنے ھی اتحاد سے استحکام حاصل کرلینا چاھا ۔ انہیں اپنی سر زمین پر فرانس کی موجودگی برابر اکھرتی رھی ۔ تاھم یہ غلبہ و تسلط تقریباً چوبیس سال سے زیادہ مدت تک برقرار نہ رہ سکا ۔ وھاں کے قوم پرستوں میں اپنے وقار کا سوال پیدا ھوا ۔ منظم صورت میں احتجاج ھوا اور قریب کی چھ مزید ریاستوں کو وفاق میں شامل کرلیا گیا تاکہ زیادہ قوت اور استحکام نصیب ھو جائے ۔ ان ریاستوں کے نام یہ ھیں :-

(۱) سنٹ گیلن (۲) گریسنز ( جسے گراؤبنڈن بھی کہا جاتا تھا ) ۔ (۳) آرگاؤ ۔ (۴) تھرگاؤ ۔ (۵) ٹسینو اور (۶) ووڈ ۔

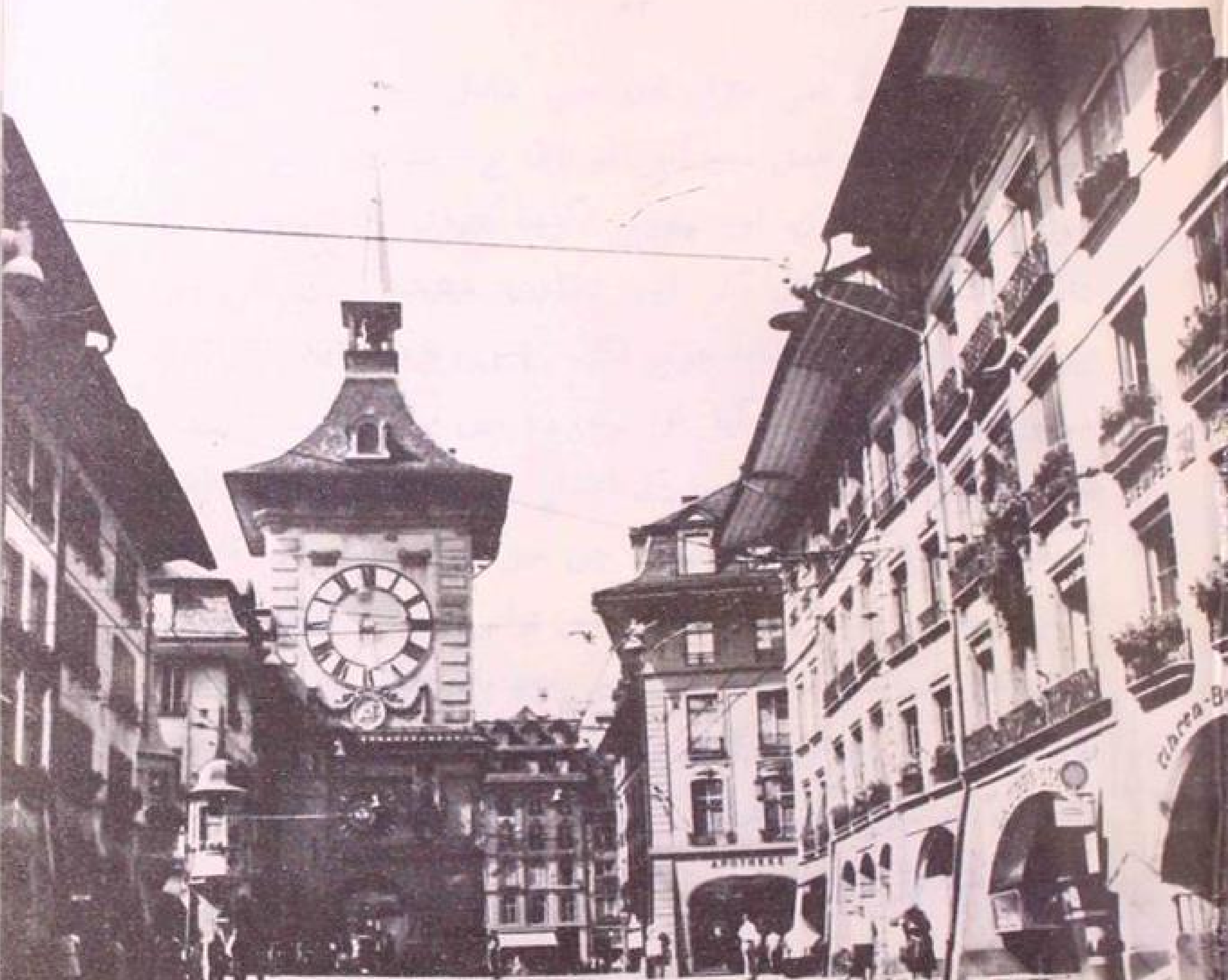
دو سال بعد یعنی ۱۸۱۵ء میں سرحدوں کا دائرہ زیادہ وسیع ھوا ۔ تین مزید ریاستیں یعنی ویلیس ، جنیوا اور نیوشیٹل بھی وفاق میں شامل ھوگئیں ۔ اس وقت سے آج تک سرحدوں میں

بازل تک راستہ بہت ہی دلچسپ رہا۔ ریل کار ایسے علاقوں سے گزر رہی تھی جو سرسبز و شاداب ہونے کے باعث حسن و جمال کے آئینہ دار تھے۔ قدرت نے اس خطہ ارض پر اپنی پوری نوازشیں عطا فرمائی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ ریل کے آس پاس کے مناظر سے نگاہ دور نہ کی جائے۔ اس اعتبار سے برن بھی اچھا مقام ہے۔

## برن

اس ضلع کا رقبہ اور آبادی پہلے ہی لکھی جاچکی ہے۔ اس کے تین نمایاں حصے ہیں۔ اول برن کا حصہ کوہ ایلپس، جو اوبر لینڈ یعنی بلند مقام کہلاتا ہے۔ وہ کئی پہاڑی چوٹیوں پر مشتمل ہے جن میں فنستن عار ہورن اور جنگ فراؤ شامل ہیں۔ دوسرا مڈل لینڈ یعنی درمیانی سر زمین جو کوہ ایلپس کے شمالی دامن میں ہے اور تیسرا سی لینڈ یعنی جھیلوں کی وادی جو شمال مغرب میں ہے۔ اول الذکر دو علاقوں میں لوگوں کا روزگار زراعت، گلہ بانی اور ڈیری سے متعلق ہے۔ سیاحوں سے بھی کچھ آمدنی ہوجاتی ہے۔ تیسرے علاقے میں زیادہ تر صنعت کار آباد ہیں۔ بیشتر گھڑی ساز ہیں۔ مذہبی اعتبار سے لوگ زیادہ تر عیسائی پروٹسٹنٹ ہیں اور جرمن زبان بولتے ہیں۔ دریائے عار کے کنارے واقع ہونے کے باعث ضلع کے مرکز میں ہے اور ملک کا صدر مقام بھی رہا ہے۔

اس کی تاریخ پرانی ہے۔ ۱۱۹۱ء میں اس کی بنیاد پڑی تھی۔ اس وقت اس کی حیثیت صرف فوجی چھاؤنی کی تھی۔ شہنشاہ فریڈرک دوم نے اس کو زیادہ اختیارات دے کر اس کا رقبہ بڑھا دیا۔ اس کی آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ۱۳۵۳ء میں اس کا الحاق سوئس وفاق سے ہوگیا۔ ۱۴۱۵ء میں عار گاؤ اور



شہر برن کے وسط میں سولھویں صدی کا گھنٹہ گھر جس میں سیاروں کا حال بتانے والی گھڑی اور ناچتی ہوئی گڑیاں لگی ہوئی ہیں۔

۱۵۳۶ء میں ووڈ نامی علاقے اس میں شامل ہوگئے - ۱۵۲۸ء میں نئی اصلاحات عمل میں آئیں تو برن نے سب سے پہلے ان کو قبول کیا - خانقاہوں اور چھوٹے گرجا گھروں کو مذہب کے دائرہٗ تنگ سے نکال کر اسے دنیاوی حیثیت دیدی گئی جس سے قومی دولت میں اضافہ ہونے لگا - ۱۸۳۱ء میں ایک فراخدل دستور العمل منظور کیا گیا اور ۱۸۴۸ء میں برن پورے وفاق کا صدر مقام بن گیا - فن تعمیر کے اعتبار سے یہاں کی عمارتیں زیادہ تر عہد وسطیٰ کی یادگار ہیں ، جن میں سے بعض کو تاریخی اہمیت حاصل ہے - وسطی علاقے میں پرانی وضع کا گھنٹہ گھر اور ایک غار جس میں سات صدیوں سے ریچھ پالے جاتے ہیں ، سیاحوں کی دلچسپی کے خاص مراکز ہیں - جدید عمارتوں میں وفاقی محل، عجائب گھر اور ۱۸۳۴ء میں قائم ہونے والی یونیورسٹی کی عمارتیں قابل ذکر اور لائق دید ہیں -

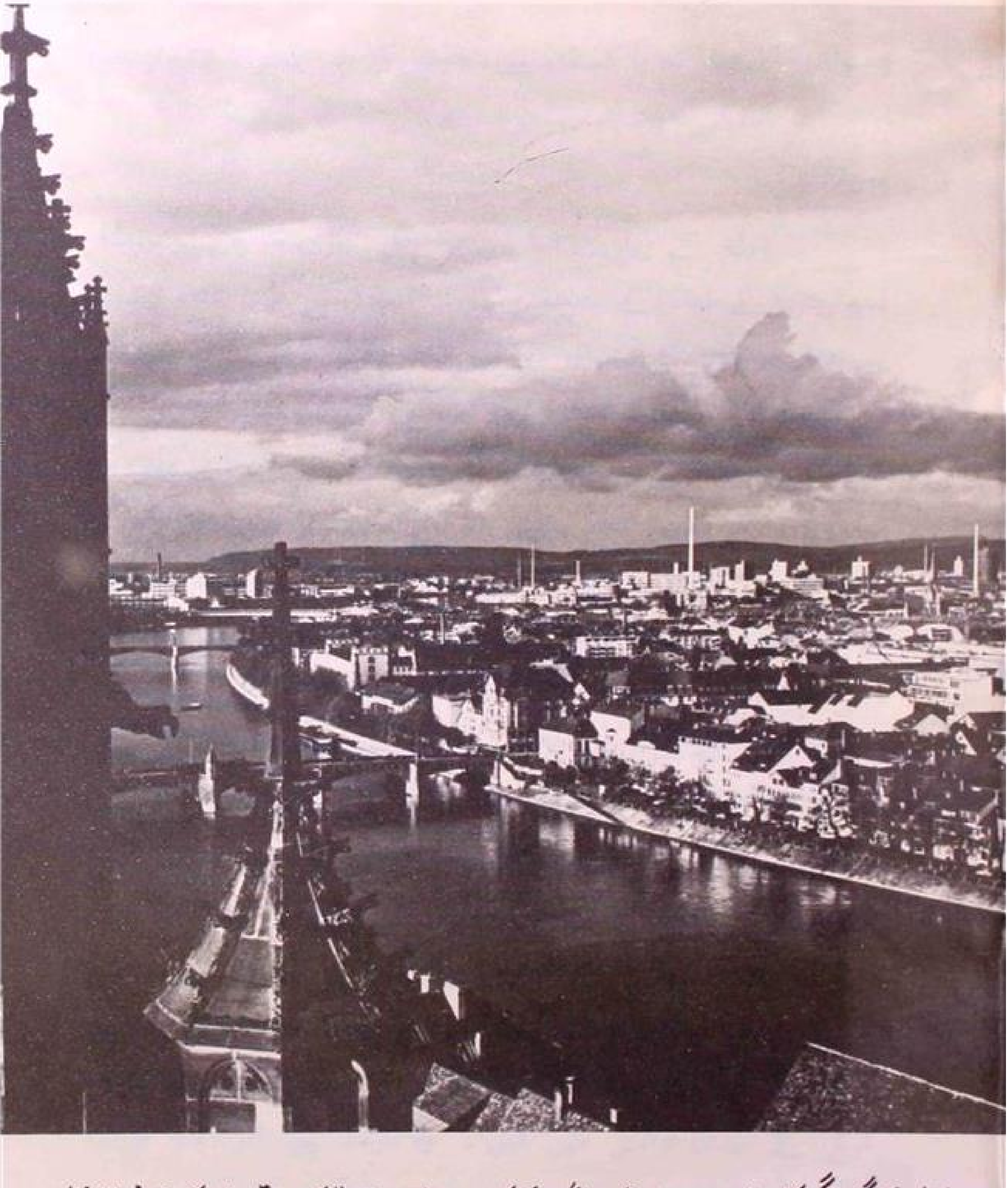
## بازل

فرانس اور جرمنی کی سرحدوں سے ملا ہوا یہ ضلع بھی اپنی رونق کے اعتبار سے مشہور ہے - دریائے رھائن اس کو دو حصوں میں قطع کرتا ہوا بہتا ہے - جنوبی حصہ کوہ جورا کے دامن میں ہے - اس لئے یہ علاقہ بھی سرسبز و شاداب ہے - یہاں کے بیشتر لوگ بھی پروٹسٹنٹ ہیں اور جرمن زبان بولتے ہیں - اہل روما نے ساتویں صدی عیسوی میں اسے آباد کیا تھا - اس کے بعد مختلف قومیں اس پر حملہ آور اور قابض رہیں - یہاں تک کہ گیارھویں صدی عیسوی میں آزاد ہوگیا اور اس نے ۱۵۰۱ء میں سوئس وفاق میں شمولیت حاصل کرلی - ۱۵۲۳ء کی اصلاحات میں یہاں مذہبی رہنماؤں کا زور گھٹا اور پادریوں سے علیحدگی اختیار کرلی - تاہم انہیں شہر میں رہنے اور اپنے طور پر عبادت

کرنے کی اجازت مل گئی - ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۳ء تک کے دو سال ہنگاموں کی نذر ہوگئے - انقلابی تحریک نے زور پکڑا اور ضلع کے دو ٹکڑے ہوگئے - دریائے رھائن ان کی درمیانی حد بن گیا - ساحل کے بائیں طرف عظیم تر بازل میں زیادہ تر دانشور یا تاجر پیشہ لوگ آباد تھے اور دوسری طرف صنعت کار رہتے تھے - کیمیکل ، دھات کی اشیا ، پارچہ بافی ، غذائی اشیا اور سلک خاص صنعتیں ھیں - ۱۰۱۹ء میں تعمیر ہونے والا ایک بڑا گرجا گھر اور ۱۴۶۰ء میں قائم شدہ یونیورسٹی کی عمارت ، سولھویں صدی کا ٹاؤن ھال اور ایک آرٹ گیلری ، جس میں فنون لطیفہ کے نادر نمونے رکھے گئے ھیں ، اب بھی سیاحوں کا مرکز نظر ھیں - ان میں مشہور فنکار ھولبین کے شاھکار شامل ھیں - شہرۂ آفاق فلسفی نیٹشے اور کال ون وغیرہ جیسی بلند ھستیوں کا یہ وطن مالوف رہا ھے - یہ بنکاری کے نظام کا بھی سب سے بڑا مرکز ھے -

## برگل سے تبادل خیالات

دوران سفر پروفیسر برگل سے تبادل خیالات کا اچھا موقع مل گیا - پروفیسر موصوف اور ان کے ایک ساتھی طب عربی پر تحقیقی کام کر رہے ھیں - ان کا اندازہ ھے کہ مجموعی طور پر بارہ کتابوں کا سیٹ تیار ھو جائیگا - اس کی طباعت و اشاعت کے لئے جامعۂ برن آمادہ نہیں ھے کیونکہ جامعہ کے فنڈ میں اس سال اچانک کمی ھوگئی ھے - بلکہ اس دفعہ تو سارے ھی اداروں کے بجٹ کم کردئے گئے ھیں - میں نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ ایک منصوبہ تیار کرکے مجھے دیں - اس کے ساتھ کتابوں کی اھمیت پر ایک سیر حاصل نوٹ ضرور لکھا جائے تاکہ فیصلہ کرنے میں آسانی ھو - میں نے خیال ظاھر کیا کہ پاکستان میں ان کتابوں کی اشاعت و طباعت پر ضرور غور کیا جائے گا لیکن ان پر



بازل کے گرجا گھر کا مینار اور دریائے رھائن کے کنارے صنعتی علاقے کی عمارتوں کا ایک خوش نما منظر۔

یہ واضح کردیا کہ پاکستان سے معاوضے کی رقم بھجوانا دشوار ہوگا اور شاید ناممکن ہو۔ یہ ملحوظ رہے۔

## سینڈوز

بازل کے ریلوے اسٹیشن پر ریل گاڑی پہنچی تو سینڈوز لیبو ریٹریز کے نمائندے موجود تھے۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے ہمارے قافلے کا استقبال کیا اور زیادہ وقت گزارے بغیر ہم کو دو گاڑیوں میں بٹھا کر سینڈوز ورکس لے گئے۔ میں اس سے قبل ستمبر ۱۹۵۶ء میں بھی بازل آیا تھا اور سینڈوز لیبوریٹریز بھی گیا تھا۔یہاں آکر مجھے تمام چیزیں یاد آنی شروع ہوگئیں۔ میں نے ان کو بتایا : ” آپ کی عمارت کی آخری منزل پر کھڑے ہوکر دیکھیں تو دور افق کے ساتھ فرانس اور جرمنی کی سرحدیں سامنے دکھائی دیتی ہیں “۔

ان کو میری اس ” معلومات “ پر بڑی حیرت ہوئی مگر میں نے ان کی حیرت کو اصل بات بتا کر دور کردیا۔ میں نے کہا کہ میں ۱۹۵۶ء میں یہاں آچکا ہوں۔ دس بجے سے ایک بجے تک ہم نے سینڈوز کے مختلف شعبوں کو دیکھا۔ یہ ایک بہت بڑا ادارہ ہے۔ دواؤں کے علاوہ بھی اس کے مختلف کاروبار ہیں جن میں رنگ سازی کا سامان بھی شامل ہے۔ سینڈوز کی فیکٹری سوئزر لینڈ میں ہے مگر اس کے کھیل کے میدان اور موٹر پارک کرنے کے میدان فرانس میں ہیں۔ وہ سرحد سے اس قدر قریب ہیں۔ اس ادارے میں کم و بیش دس ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس کی شاخیں اور دفاتر دوسرے ملکوں میں بھی قائم ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر اس کے تمام اداروں میں کام کرنے والوں کی تعداد تیس ہزار سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

ہمارے میزبان جناب کراپ تھے جو شروع سے آخر تک

ہمارے ساتھ رہے۔ یہ ''سوئزر لینڈ پاکستان دوستی انجمن،، کے صد بھی ہیں۔ بہت دلچسپ انسان ہیں۔ ایک بجے لنچ کا انتظام سینڈوز کی طرف سے تھا۔ یہ لنچ انہوں نے اپنے افسروں کی کینٹین میں دیا جو اعلیٰ قسم کے کسی ہوٹل سے کم تر نہیں تھی۔ اس لنچ میں ادارے کے ڈائریکٹر جنرل بھی شریک ہوئے۔ لنچ تقریباً پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔ کئی قسم کے کھانے تھے اور دوران طعام تبادل خیال کا سلسلہ جاری تھا۔

میں نے ان سے کاروباری قسم کی گفتگو بھی کی۔ زعفران کی فراہمی کا مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ زعفران تیار کرسکتے ہیں یا نہیں۔ قدرتی زعفران کی مقدار دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ شاید کچھ عرصے میں بالکل ہی نایاب ہو جائے۔ اس کے برعکس اس کی ضرورت اور اس کے ساتھ مانگ بتدریج بڑھتی جارہی ہے۔ لہذا مصنوعی زعفران یعنی ''سنتھے ٹک زعفران،، ناگریز ہے۔ بشرطیکہ وہ افعال و خواص میں اصل سے قریب تر ہو۔ سینڈوز کو اس سے کوئی دلچسپی نہین تھی۔

فاخرہ کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ یہ لوگ فارسی لفظ ''حنا،، کے نام سے اسے جانتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو رنگ تیار کرنے میں مہارت تامہ حاصل ہے، کیوں نہ آپ مصنوعی مہندی تیار کریں۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ آج کل ''الرجی،، کا مسئلہ بھی نازک ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے قدرتی حنا تک توجہ محدود رکھنی چاہئے، مصنوعی مہندی کوئی مسئلۂ صحت پیدا نہ کردے۔

مجھے ان کے اس بیان پر تعجب نہیں ہوا۔ مصنوعی مہندی سے الرجی کا مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔ کھانے کی جن چیزوں

کو مصنوعی طور پر تیار کیا گیا ہے اور انہیں ایسنس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ان کے بارے میں سوچ بچار کرنا ضروری ہے کہ ان سے مسائل صحت پیدا ہوسکتے ہیں اور اصولاً ان کے بارے میں تشویش ہوسکتی ہے۔

## چڑیا گھر

برن جانے کے لیے گاڑی میں ابھی دو گھنٹے تھے۔ طے پایا کہ بازل میں جو قابل دید حدیقۂ حیوانات (چڑیا گھر) ہے اسے دیکھ لینا چاہئے۔ میں نے اتفاق رائے کیا۔ یاد نہیں آیا کہ میں نے اپنی زندگی کے کسی دور میں کوئی چڑیا گھر دیکھا تھا۔ مجھے ذاتی طور پر اس خیال سے وحشت ہوا کرتی ہے کہ جنگل بیابان کے جانوروں کی آزادی سلب کرکے ان کو انسانوں کی تفریح طبع کے لئے ایک جگہ بند کردیا جائے۔ میں نے ذہنی طور پر اس جبر کو کبھی قبول نہیں کیا ہے۔ میں انفرادی طور پر گھروں میں کبوتر، توتے، بلیاں اور کتے پالنے کا بھی حامی نہیں ہوں۔ میں کبھی کبھی مسز ڈی سلوا سے کہتا ہوں کہ وہ کتے پالنے چھوڑ دیں۔ انہوں نے گھر کی حفاظت کے لئے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اگر وہ کتوں کو چھوڑنا بھی چاہیں تو کتے انہیں نہیں چھوڑینگے۔ ان کے راتب پر پانچ رپے روز صرف ہوتے ہیں۔ مگر آج کل عام لوگوں کی زندگی جس انداز میں گزر رہی ہے اس نے جذبات کو سرد کردیا ہے اور وہ اس لئے کہ آجکل انسان خود طرح طرح کی قیدوں میں جکڑا ہوا ہے۔

میں نے سنا تھا کہ برن کے چڑیا گھر میں جانوروں کو کافی آزادی نصیب ہے۔ یعنی ان کے لئے بڑی حد تک جنگل کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ پرندے اپنے پروں سے اڑکر سارے شہر میں گھومتے پھرتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو گویا بسیرا لینے

کے لئے واپس آجاتے ھیں ۔ انھیں صبح اور شام اچھی خوراک بھی دی جاتی ھے ۔ بہت بڑے باغیچے میں بعض چوپائے اچھلتے کودتے پھرتے ھیں ۔ اس علاقے کے چاروں طرف کانٹے دار تار لگائے گئے ھیں تا کہ بچے ان جانوروں کے قریب نہ پہنچ سکیں ۔ البتہ خود چوپائے پھرتے گھومتے تار کے جنگلے کے قریب آجاتے ھیں کیونکہ بچے ان کو سبزیاں ، پھل یا بھنے ھوئے چنے کھلاتے ھیں ۔ شیر ایک بہت بڑے جزیرے پر کسی زنجیر یا جنگلے کے بغیر رکھے گئے ھیں ۔ البتہ اس مصنوعی جزیرے کے چاروں طرف اتنی چوڑی اور گہری خندق بنائی گئی ھے کہ کوئی شیر چھلانگ لگا کر یا اچھل کر زائرین تک نہیں پہنچ سکتا ۔ اس جزیرے پر مصنوعی پہاڑیاں اور غار ھیں جن کے راستے آر پار ھیں ۔ شیر آپس میں لڑتے لڑتے ان پہاڑیوں پر چڑھتے یا غار میں ایک طرفسے گھس کر دوسری طرف نکل جاتے ھیں ۔ بن مانسوں کے جنگلے میں بھی قد آور درخت ھیں جن پر وہ چڑھ کر ڈالیوں پر چھلانگیں لگاتے ھیں ۔ غرض یہ کہ ان سب کے لئے قدرتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ھے جو قابل تعریف ھے ۔

کل ریڈیو پر ایک خبر سننے میں آئی کہ اپنے صوبۂ سرحد کے شہر پشاور میں ایک شخص کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کردیا گیا ۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی ۔ آئے دن قتل ھوتے رھتے ھیں لیکن جس دل دوز اور دل سوز انداز میں یہ حادثہ ھوا وہ افسوسناک تھا ۔ پھر اس حادثے کے بعد سارے ملک میں جو پکڑ دھکڑ شروع ھوئی ، وہ اس سے زیادہ حیرت انگیز کہی جاسکتی ھے ۔ خود پکڑنے والوں کو بھی اس کا احساس ھے کہ بے گناہ پکڑے جارھے ھیں اور اصل مجرم روپوش ھیں ۔ نظم و نسق قائم کرنے والے مقدمہ چلوا کر عدالتی فیصلہ چاھتے ھیں تا کہ اعتراض

کرنے والوں کے منہ بند ہوجائیں ۔ میرا ذاتی تاثر تو یہ ہے کہ کل پاکستان بہ حیثیت مجموعی ایک بڑا قید خانہ ہے ۔ اس کے مہتمم چند جیلر ہیں جن کے پیش نظر انسانی اقدار کا کوئی پہلو نہیں ہے ۔ اس قید خانے میں سے چند افراد کو پکڑ کر جیل میں ڈال دینا دراصل قید در قید کے مترادف ہے ۔ اس صورت حال سے دامن بچانا ضروری ہے ۔

مجموعی طور پر اس چڑیا گھر کو بہت اچھا بنایا گیا ہے ۔ یعنی ماہرین حیوانات اور ماہرین نباتات کے اشتراک عمل نے اسے بازل کی ایک اچھی تفریح گہ بنادیا ہے ۔ یہاں سبھی قسم کے وہ چوپائے اور پرندے جمع کردئے گئے ہیں جو ملک کی آب و ہوا میں بخوبی زندہ رہ سکتے ہیں ۔ پھر ان کو زندہ رکھنے اور پروان چڑھانے کے لئے جملہ آسائشیں فراہم کی گئی ہیں ۔ ان کے لئے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے وہ قدرتی ماحول بھی پیدا کیا گیا ہے جس میں وہ رہنے سہنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ چڑیا گھر کے دفتر میں ایک فہرست بھی مرتب کر کے رکھی گئی ہے جس میں وہاں موجود جانوروں کے خصائل اور عادات و اطوار کے علاوہ ان کی عمر اور توقع حیات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں تا کہ تحقیقات کرنے والے مطالعہ کر کے اپنی معلومات مکمل کرلیں ۔ اس لئے والدین نے اپنے بچوں کو وہاں لے جا کر اسے تعلیم و تربیت دینے کا مقام بنادیا ہے ۔ چنانچہ بچے بکثرت موجود تھے اور ان کے والدین اور دوسرے رشتہ دار ہر قدم پر ان کو سمجھاتے رہتے تھے ۔ یعنی ان کے لئے وہ صرف تفریح کا مقام نہیں رہا تھا، تعلیم بھی تھی ۔ سب سے زیادہ دلچسپی چڑیا گھر کے شعبۂ بن مانس میں لی جارہی تھی ۔ وہاں بچے ہی نہیں بڑی عمر کے لوگ بھی بیٹھے بندروں کی نقل و حرکت کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہے تھے ۔

ممکن ہے کہ وہ لوگ انسان کو بن مانس سے قریب سمجھ کر ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی داد دے رہے ہوں۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ لوگ اردو سمجھ لینگے تو میں حضرت اکبر الہ آبادی کا مشہور شعر پڑھ دیتا :

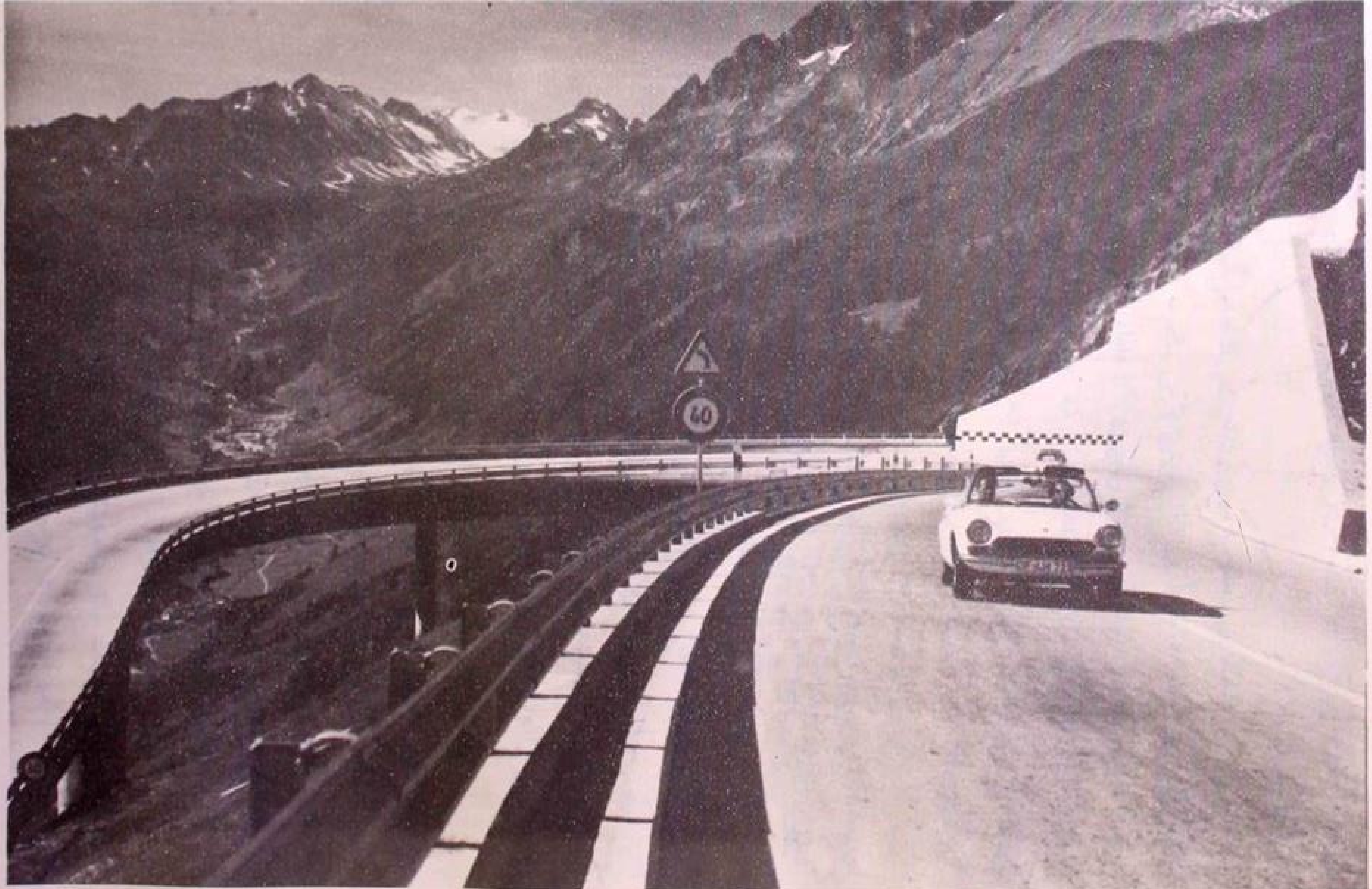
کہا منصور نے خدا ہوں میں - ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

چڑیا گھر کی فضا زیادہ خوشگوار رکھنے کے لئے طرح طرح کے پھولدار درخت ، پودے اور بیلیں لگائی گئی ہیں - پھولوں کی مہک فضا میں پھیل رہی تھی اور ان کی رنگینی جنت نگاہ بن رہی تھی -

چھ بجے کے قریب ہم برن واپس جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے -

## ریلوے نظام

سوئزر لینڈ میں ریلوے نظام کی تاریخ تقریباً سوا سو سال پہلے ۱۸۴۷ء میں شروع ہوتی ہے - اس وقت پہلی ریلوے لائن تھوڑے سے حصے میں ڈالی گئی تھی - چونکہ بیشتر حصہ پہاڑی ہے ، اس لئے سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کر ریلوے لائن کے اعتبار سے سطح زمین کو ہموار کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا - چنانچہ اس نظام نے آہستہ آہستہ ترقی کی - پھر بھی اس سال تک سوئس فیڈرل ریلویز کی مجموعی لمبائی دو ہزار آٹھ سو ساٹھ کلو میٹر ہوگئی ہے - چونکہ برقی قوت با آسانی میسر آسکتی ہے ، اس لئے تمام گاڑیاں کوئلے یا ڈیزل کے بجائے بجلی سے چلتی ہیں - قدرتی طور پر ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے - وقت کی پابندی یہاں کے ریلوے نظام کا طرۂ امتیاز ہے - کیا مجال ہے کہ آپ ریلوے اسٹیشن پر اپنے کسی عزیز یا دوست کا خیر مقدم کرنے پہنچیں اور معلوم ہو کہ گاڑی ذرا لیٹ آئیگی - اگر آپ ہی کو وہاں پہنچنے




کوہ ایلپس کے جانب جنوب ریلوے پل جس پر سے موٹریں بھی گزر سکتی ہیں۔

میں دیر ہوجائے تو آپ کے عزیز پلیٹ فارم پر اتر کر آپ کا انتظار کرینگے ۔

میں جب بھی مغرب میں ریلوے کا سفر کرتا ہوں تو مجھے ان کے نظم و ضبط کی داد دینی پڑتی ہے ۔ ساتھ ہی میں سوچتا ہوں کہ پاکستان میں ریلوے کا نظام آخر اس معیار کا کیوں نہیں ہوسکتا ۔ دل چاہتا ہے کہ ہم بھی ترقی کی ایسی ہی راہ پر چل پڑیں اور کوشش کریں کہ موانع دور ہو جائیں اور ہم اپنے ریلوے نظام پر فخر کرسکیں ۔

سوئس ریلوے نظام پر غور کرتا رہا کہ سفر کی سہولتیں اور سفر کو کم کرنے کی کیا راہیں اختیار کی گئی ہیں ۔ مثلاً کہیں کہیں شارٹ کٹ کرنے کے لئے پہاڑیوں میں سرنگیں بنائی گئی ہیں تا کہ زیادہ چکر کھانا نہ پڑے ۔ ایسی سرنگیں انڈیا کے شہر شملے کی پہاڑیوں میں بھی بنائی گئی ہیں ۔ سوئزر لینڈ میں بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا ۔ متعدد مقامات پر انہیں کسی پہاڑی کا سینہ چیر کر دوسری طرف نکلنا پڑتا ہے ۔ لیکن سفر کرنے والوں کو زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا ۔

پچھلے سال کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہےکہ سوئزر لینڈ میں اکیس کروڑ پانچ لاکھ ساٹھ ہزار انسانوں نے سفر کیا ۔ تین کروڑ باون لاکھ نوے ہزار میٹرک ٹن سامان لایا لیجایا گیا ۔ سارے نظام پر تقریباً دو ارب انتیس کروڑ پچیس لاکھ تین ہزار فرانک خرچ ہوئے ۔ مسافروں اور سامان کی نقل و حرکت سے دو ارب ستائیس کروڑ ستاون لاکھ اٹھائیس ہزار فرانک کی آمدنی ہوئی ۔ گویا کچھ نقصان رہا ۔ لیکن بات یہ ہے کہ حکومت اس نظام کو خدمت خلق سمجھتی ہے ۔ اپنا ذریعۂ آمدنی نہیں گردانتی ۔ ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ سرکاری نظام کے

علاوہ دو ریلوے لائنیں ذاتی ملکیت میں بھی ھیں ۔ ایک برن سے لوٹش برگ جاتی ھے جس کی لمبائی ایک سو پندرہ کلو میٹر ھے ۔ دوسری برن سے رھائنشین جاتی ھے جس کی لمبائی تین سو تریسٹھ کلو میٹر ھے ۔

## شاھراھیں

ھم اگر چاھتے تو سڑکوں کے ذریعہ سے بھی بازل سے برن جاسکتے تھے ۔ سڑکیں نہایت وسیع اور ھموار ھیں ۔ سارے ملک میں ان کا جال سا پھیلا ھوا ھے ۔ پچھلے سال تک صرف شاھراھوں کا مجموعی طول اٹھارہ ھزار آٹھ سو کلو میٹر تھا ۔ ان میں نو سو چودہ کلو میٹر کی وہ سڑکیں شامل ھیں جو قومی شاھراہ کہلاتی ھیں اور صرف ان موٹر گاڑیوں کے لئے مخصوص ھیں جو ذاتی استعمال کی ھوں ۔ یہاں ڈاک خانہ جات کی کچھ گاڑیاں بھی چلتی ھیں جو ڈاک کے تھیلوں کے علاوہ مسافروں کو بھی لے جاتی ھیں ۔ پچھلے سال ایسی گاڑیوں سے پانچ کروڑ چونتیس لاکھ مسافروں نے سفر کیا ۔ یہ زیادہ تیز رفتار نہیں ھوتیں ۔ ھر آبادی میں ٹھیر کر چلتی ھیں ۔ کرایہ کم ھوتا ھے ۔ اس لئے غریب لوگوں یا بہت کم فاصلے طے کرنے والوں کے لئے غنیمت ھیں ۔

اس وقت ملک میں موٹر گاڑیوں کی کل تعداد انیس لاکھ بانوے ھزار پانچ سو ھے جن میں سے سترہ لاکھ چورانوے ھزار دو سو پچیس ذاتی ملکیت میں ھیں ۔ ان کے علاوہ تیرانوے ھزار تین سو چھیانوے ٹرک ، نوے ھزار تین سو پچیس موٹر سائکلیں ، نو ھزار سات سو اٹھاون بسیں اور چار ھزار سات سو چھیاسٹھ زراعتی ٹریکٹر استعمال ھو رھے ھیں ۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ھے ، سوئزر لینڈ پہاڑی ملک ھے ۔ اس کے بیشتر شہروں میں سڑکیں اونچی نیچی یا سانپ کی طرح بل

کھاتی گزرتی ہیں - خصوصاً شاہراہیں بہت کم ہموار اور سیدھی ہیں - جگہ جگہ خطرناک موڑ آتے ہیں - کہیں کہیں سڑک کے دائیں یا بائیں طرف کھڈ بھی ہیں جو بہت ہی گہرے ہیں - لیکن دوسرے ملکوں کے مقابلے میں حادثات بہت کم ہوتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہوا کہ گاڑیاں چلانے والوں کو اپنے علاوہ دوسروں کی حفاظت کا احساس ہوتا ہے - وہ انسانی زندگی سے کھیلنا نہیں چاہتے - کبھی اوور ٹیکنگ نہیں کرتے - ہر موڑ پر ایسی رکاوٹیں لگائی گئی ہیں کہ گاڑیوں کی رفتار خود بخود کم ہوجاتی ہے - یہ صورت نہ ہو تو حادثات کے باعث بہت سی جانیں ضائع ہوسکتی ہیں -

## جہاز رانی

میں نے لگے ہاتھوں جہاز رانی کے نظام کا مطالعہ بھی کرلیا - یہ ملک کسی ساحل سمندر پر واقع نہیں ہے - لیکن بعض جھیلیں بہت طویل و عریض ہیں جن میں بار برداری اور سفر کے لئے چھوٹے بڑے جہاز چلتے ہیں - شروع میں سارا نظام نجی اداروں کے سپرد تھا - لیکن حکومت نے ۹ اپریل ۱۹۴۱ء کے ایک فرمان کے ذریعہ اس پر سرکاری احتساب کردیا - بازل میں تمام جہازوں کی رجسٹری کا دفتر قائم ہے - پچھلے سال کے آخر تک بڑے رجسٹری شدہ جہازوں کی تعداد ستائیس تھی ، جن کا مجموعی وزن دو لاکھ تینتالیس ہزار تین سو پچھتر ٹن تھا - ان کے ذریعے سال کے آخر تک اٹھتر لاکھ انسٹھ ہزار پانچ سو اکیس ٹن سامان بازل لایا گیا اور تین لاکھ انتیس ہزار سات سو تیس ٹن سامان بازل سے لیجایا گیا -

ہوائی جہازوں کا محکمہ بھی بہت منظم ہے - سوئس ایئر لائن کا قیام ۱۹۳۱ء میں ممکن ہوسکا تھا - پچھلے سال کے

دوران میں قومی اور بین الاقوامی راستوں پر پچپن لاکھ انچاس ہزار آٹھ سو ستائیس مسافروں نے سفر کیا ۔ دو لاکھ پچپن ہزار نو سو بانوے ٹن سامان لیجایا گیا جس میں ڈاک کی اشیاء شامل ھیں ۔ جہازوں نے مجموعی طور پر پندرہ کروڑ پچیس لاکھ اکیاون ہزار کلو میٹر سفر کیا ۔ اس وقت تک ھوائی جہازوں کی تعداد پینتالیس ھے ۔

## عوامی رابطے

پچھلے سال تک ملک بھر میں تین ہزار نو سو بہتر ڈاک خانے تھے ۔ اب انتالیس لاکھ بارہ ہزار نو سو اکہتر ٹیلی فون ھر وقت کام کرتے رھتے ھیں ۔ میڈیم ویو کے تین بڑے ریڈیو اسٹیشن قائم ھیں جبکہ شارٹ ویو کا صرف ایک اسٹیشن ھے ۔ ٹیلے وژن کے تین اسٹوڈیو ھیں ۔ ان سب کے لئے ایک سو سے زیادہ ٹرانسمٹر کام کرتے ھیں ۔ ریڈیو اور ٹیلے وژن کا سارا خرچ لائسنس فیس اور اشتہارات سے چلتا ھے ۔ حکومت کوئی رقم ادا نہیں کرتی ۔ کوئی اشتہار پندرہ سیکنڈ سے زیادہ کا نہیں ھوتا جو دن میں کئی بار دکھایا جاتا ھے ۔ پچھلے سال تک ریڈیو کے لائسنسوں کی تعداد بیس لاکھ چھیہتر ہزار اور ٹی وی کے لائسنسوں کی تعداد سترہ لاکھ انسٹھ ہزار تھی ، جن میں رنگین ٹی وی سیٹوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ شامل ھے ۔ پچھلے سال دونوں نظاموں پر چار ارب سرسٹھ کروڑ اناسی لاکھ فرانک خرچ ھوئے ۔ آمدنی تقریباً اتنی ھی تھی ۔ یعنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جاتے ھیں ۔

## کاک ٹیل

ضرورت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں اسی روز بازل سے برن واپس نہ آتا لیکن ترکی کے قونصل جنرل جناب تریلی صاحب نے

میرے اعزاز میں کاک ٹیل کا انتظام کر رکھا تھا اور میں نے اس دعوت کو بادل ناخواستہ قبول کرلیا تھا ، کیونکہ مجھے کاک ٹیل میں پیش ہونے والی چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا ۔ لیکن مجھے ان کی دل شکنی کسی عنوان گوارا نہیں تھی ۔ آخر مسجد کے زیر سایہ بت کدے بھی بن ہی جاتے ہیں ۔ مسجد میں جانے والے ان سے دامن بچا کر نکل جاتے ہیں ۔ جب تریلی صاحب پاکستان میں ترکی کے قونصل جنرل تھے تو ان کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے ۔ یہ تعلقات بے غرض اور بے لوثی کی بنیاد پر تھے ۔ مجھے وہ بےحد پسند تھے ۔ میں ان کی بہت خاطرداری کرتا تھا ۔ جب وہ پاکستان سے واپس آنے لگے تو میں نے ان کو ایک اچھا تحفہ دیا جو پاکستان سے وابستہ ان کی یاد کو تازہ رکھ سکتا تھا ۔ لیکن اس وقت ہم دونوں میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ کبھی وہ سوئزر لینڈ میں ترکی کے قونصل جنرل مقرر ہونگے اور میں برن پہنچ کر ان سے ملونگا ۔ جب انہوں نے میرے اعزاز میں کاک ٹیل کی تجویز پیش کی تو میں نے کہا کہ جب میں بادہ نوشی کا شغل نہیں کرتا تو یہ اہتمام کیوں ہو لیکن انہوں نے رسم و رواج کا واسطہ دے کر مجھ سے حامی بھروالی ۔ یہ انتظام بہت ہی پرتکلف تھا ۔ اس میں ایک سو سے زیادہ سفارتی نمائندوں اور پروفیسروں کو مدعو کیا گیا تھا ۔ ان میں فرانس ، انڈونیشیا ، نائجیریا ، ملائشیا ، ایران ، پاکستان ، برطانیہ اور پولینڈ وغیرہ کے سفرا ، جامعۂ برن کے اہم اساتذہ ، ان سب کی بیگمات شامل تھیں ۔ میں عموماً ایسے موقعوں پر اپنی بچیوں کو ساتھ نہیں لے جاتا ۔ لیکن یہ غیر ملک تھا ۔ وہ ہوٹل میں رہتیں تو اکتا جاتیں ۔

تریلی صاحب نے ایک ایک مہمان سے میرا تعارف کرایا ۔

مسز ڈی سلوا ، سعدیہ اور فاخرہ ان کی بیگمات سے گھل مل گئیں لیکن محض باتوں کی حد تک ۔ مسز ڈی سلوا نصرانی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں لیکن پینے پلانے سے سخت پرہیز کرتی ہیں ۔ عیسائی مذہب میں شراب نوشی کو اس شد و مد کے ساتھ ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے جتنا کہ اسلام میں ہے ۔ لیکن اس کو برا کہہ کر اس سے بچنے کی تاکید ضرور کی گئی ہے ۔

تریلی صاحب پاکستان کی طرح اس ملک میں بھی بہت جلد ہر دلعزیز ہوگئے تھے ۔ ان کی خوش مزاجی ان کے لئے بڑا اثاثہ ہے ۔ وہ ہر ایک سے پرخلوص انداز میں ملنے اور مزاحیہ باتیں کرنے کے عادی ہیں ۔ ایک ڈپلومیٹ کے لئے اس کردار کا ہونا ضروری ہے ۔

دو گھنٹے تک کاک ٹیل کا سلسلہ جاری رہا ۔ بعض مہمان گرامی اپنی بیگمات سمیت بہت زیادہ بے تکلف تھے ۔ جام پر جام چڑھا رہے تھے ۔ کسی طرح ان کی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی ۔ آخر تریلی صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب میں ذرا سنجیدہ ہوکر ان کے درمیان جاتا ہوں ۔ شاید اس طرح مسئلہ حل ہو جائے ۔

کاک ٹیل کے بعد جب مہمان چلے گئے تو تریلی صاحب ہم پانچوں کو ھانگ کانگ ریستوراں میں لے گئے ۔ ان کے ساتھ ہم نے چینی کھانا کھایا ۔ ذرا سوچنے کی بات ہے ۔ میزبان ترکی نژاد ، مہمان پاکستانی ، سوئزر لینڈ کی سر زمین اور کھانا چینی انداز کا ۔ مجھے تریلی صاحب کے ذوق لطیف کی داد دینی پڑی ۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے ۔ میری پسند اور ناپسند کو جانتے تھے ۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ میرے ساتھ تین خواتین ہیں ۔ کھانے سے فارغ

ہوکر رات کے تقریباً گیارہ بجے انہوں نے ہم کو ہمارے ہوٹل پر اتار دیا اور چلے گئے ، مگر اس طرح کہ موٹر سے اترے اور گلے مل کر گئے ۔ مجھے ان کا مشرقی انداز ہمیشہ پسند آیا ہے ۔ انہوں نے یہ گوارا نہ کیا کہ مجھے موٹر سے اتار تے اور ٹا ٹا کہہ کر روانہ ہوجاتے ۔ ان میں انسانی خوبیاں بہت زیادہ ہیں ۔ میری دلی تمنا ہے کہ ایک بار جب وہ اپنے وطن مالوف میں ہوں ، میں وہاں جا کر ان سے ملوں اور خوب سیر کرنے کے ساتھ ساتھ اس اسلامی ملک کی مفصل معلومات جمع کروں ۔ میں ترکی کی سیاحت کرچکا ہوں لیکن اس وقت تریلی صاحب سے واقفیت نہیں تھی اور یہی سب سے بڑی کمی تھی ۔

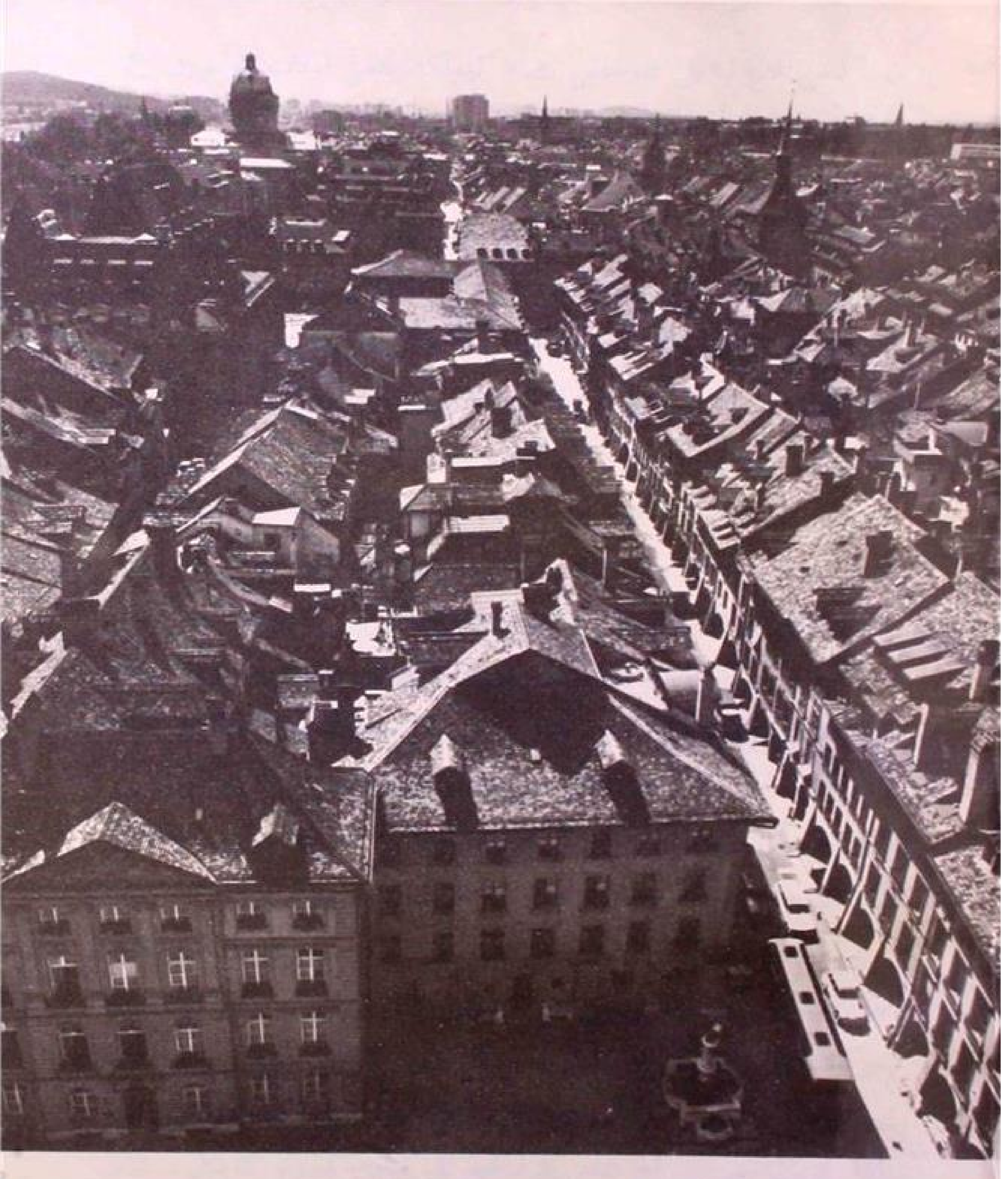
## برن میں

برن کے دوران قیام میں میری مصروفیات بہت زیادہ تھیں ۔ جلسے میں شریک ہونا اور مقالہ پڑھنا اصل مقصد سفر تھا ، لیکن یہ سرکاری دورہ نہیں تھا ۔ ایک ضمنی مقصد یہ تھا کہ اس ملک کے اہم شہروں کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے اور اس کی بنیاد پر اپنی یاد داشت قلم بند کی جائے اور اس کی اشاعت سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے ۔ ظاہر ہے کہ ہر فرد کا نقطۂ نظر جدا گانہ ہوتا ہے ۔ ہر شخص حقائق کے ساتھ اپنے ذاتی تاثرات کو سمو دیتا ہے ۔ اس کی اہمیت ہوتی ہے ۔ ورنہ سوئزر لینڈ اور اس کے حالات کے بارے میں متعدد کتابیں موجود ہیں اور آئے دن ان کے بارے میں مقالات روزناموں اور ماہناموں میں چھپتے رہتے ہیں ۔

کل کی مصروفیات دل چسپ ضرور تھیں ، لیکن اعصاب پر تھوڑا بہت اثر پڑا تھا ۔ نیند بھی حسب ضرورت نہیں آئی تھی ۔ اس لئے طبیعت پر گرانی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ کچھ بڑھتی ہی رہی ۔ لیکن میں ایسی صورت میں صاحب فراش ہوجانے کا عادی نہیں ہوں اور نہ وقت کا تقاضا اس کی اجازت دے سکتا تھا ۔

### نظام زندگی میں بے قاعدگی

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ۔ میرے روزمرہ کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آتا ۔ جو روش شروع سے اختیار کی ہے اس پر گامزن رہتا ہوں ۔ سوائے اس کے کہ اس میں دوران سفر



برن میں منسٹر مینار سے نظر آنے والا قدیم حصۂ شہر نئی عمارتوں کے مقابلے میں حسنِ تضاد پیش کرتا ہے۔

میں کسی قدر تبدیلی ہوجاتی ہے، کیونکہ بعض اوقات دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی گزرتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ نظام جسم برہم ہے۔ اس کی حیاتیاتی گھڑی کی سوئیاں تیزی سے گھوم رہی ہیں اور اس لئے بے قاعدگی کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ کوئی نظم پیدا نہیں ہوسکا اور نہ شاید اس پورے سفر میں ایسا ممکن ہوگا۔ کیونکہ جب ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا پڑے اور ہر ملک کا علاحدہ نظام ہو تو اس کی پابندی کرنی ہی پڑتی ہے۔ میں رات کو ایک مقررہ وقت تک کام کرنے کے بعد بستر پر دراز ہوتا ہوں تو فوراً نیند آجاتی ہے کیونکہ جسم تھک تھکا کر آرام چاہتا ہے۔ دن بھر کی مصروفیات میں تھکن تو ضرور محسوس ہوئی مگر اس کی نوعیت دوسری تھی۔ اس لئے فوراً آنکھ نہ لگ سکی۔ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ بے وقت سویا تو بھی صبح کو معمول کے مطابق جلد اٹھونگا۔ اب تک تو زندگی میں بیدار ہونے کے لئے الارم لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ روزمرہ معمول کے اس حصے پر خود بخود عمل ہوتا ہے یا نہیں!

صبح آنکھ تو وقت پر کھل گئی مگر سر میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ یہ تھوڑی سی بے قاعدگی کا نتیجہ تھا۔ لیکن بےحس و حرکت پڑا نہیں رہا۔ فوراً پلنگ سے اٹھا۔ سرد موسم اور پہاڑی مقام ہونے کے باوجود سرد پانی سے غسل کیا اور نماز فجر ادا کرکے میں نے آج شام کے لیکچر کی تیاری شروع کردی۔ شام ہمدرد کے ہر اجتماع میں ابتدائی کلمات ہمیشہ میں ہی پیش کرتا ہوں۔ علاوہ ازین اور بھی تقریروں وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس لئے مجھ پر ان چیزوں کا کوئی بار نہیں ہوتا۔ مگر آج میرا ذہن ایک قسم کی کاوش میں مبتلا تھا۔ دماغ نے

محسوس کرلیا کہ آج یورپ کے ایک بڑے متمدن ملک میں عالمی انداز کے ایک اجتماع سے طب عربی کے بارے میں مخاطب ہونا تھا ۔ اور یہ خطاب بھی تھا ایسے سامعین سے جو سب کے سب علما و فضلا میں شمار ہوتے ہیں ۔

## جامعۂ برن میں موضوع خطاب

''اسلام اینڈ اوکسی ڈنٹ''، جامعۂ برن کا ایک موضوع ہے جس پر وہ سال میں ۱۲ عالمی اہل علم کو دعوت فکر و خطاب دیتی ہے ۔ اس کے تحت مجھے دعوت خطاب ملی تھی ۔ غالباً پروفیسر برگل صاحب کے مشورے سے موضوع خطاب یہ قرار پایا تھا :

''یونانی-عربی طب اور جدید مغربی طب — اختلاف یا اتفاق''

**Traditional Greco-Arabic & Modern Western Medecine: Conflict or Symbiosis** یہ انتہائی قدیم موضوع ہے اور ایک دنیا کی بڑی جامعہ میں بلند مرتبہ علمائے طب و سائنس کے سامنے اس پر کلام کرنا بڑی ذمہ داری تھی ، مگر میں نے اسے پورے جذب و خلوص کے ساتھ قبول کرلیا تھا ۔ میں نے اپنے مقالے کی تیاری میں گزشتہ چند ماہ بڑی محنت کی تھی اور اس مقالے کو اس قابل بنا دیا تھا کہ اسے ایک عالمی مجلس میں پیش کیا جاسکے ۔ اس قبولیت خطاب کے وقت بڑی شدت کے ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ میں آواز طب کو قلب یورپ میں جا کر بلند کرسکوں گا ۔ آخر پوری زندگی طب کے لئے وقف کی ہے اور اب میرے لئے یہ مواقع آگئے ہیں کہ میں دنیا بھر میں جا کر بات و خطاب کروں ۔ ۱۹۷۱ء سے میں اس مقصد کے لئے دنیا بھر میں مارا مارا پھر رہا ہوں ۔ مقالہ تو کراچی سے روانگی سے قبل تیار کرلیا تھا تاہم اب فرصت میں بیٹھ کر نظرثانی کی اور آخری نقطے لگا دیے ۔ اس دوران میں میرے ہم

سفر ایک ایک کر کے بیدار ہوچکے تھے اور ناشتہ کا آرڈر دیدیا گیا تھا ۔

پونے دس بجے کے قریب جناب پروفیسر برگل تشریف لے آئے ۔ ہم ان کے ہمراہ جامعۂ برن کے شعبۂ طبیعیات میں گئے ، باقی شعبوں پر بھی سرسری نظر ڈالتے گئے ۔ دل پر بڑا اچھا اثر ہوا ۔

## تعلیم

مجھے تعلیم اور مسائل تعلیم سے ذاتی دل چسپی ہے ، اس لئے میں نے آج کی صحبت میں اس کی سعی کی کہ تعلیم اور سوئزر لینڈ کے موضوع پر زیادہ سے زیادہ تبادل خیال کروں اور معلومات حاصل کر کے سوئزر لینڈ کے نظام تعلیم پر غور کروں اور نتائج اخذ کروں ۔ میری معلومات کا خلاصہ یہ ہے : سوئزر لینڈ میں سات یونیورسٹیاں ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ پرانی بازل کی یونیورسٹی ہے جو ۱۴۶۰ء میں قائم ہوئی تھی ۔ پھر زیورخ میں ۱۵۲۳ء میں ایک تعلیمی اکیڈمی قائم ہوئی جو ۱۸۳۳ء میں باقاعدہ یونیورسٹی بن گئی ۔ اسی طرح برن میں ۱۵۲۸ء میں اکیڈمی اور پھر ۱۸۳۴ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی ۔ جنیوا اور لوزین میں علی الترتیب ۱۵۵۹ء اور ۱۵۳۷ء میں اکیڈمیوں اور ۱۸۷۳ء اور ۱۸۹۸ء میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا ۔ فرائی برگ اور نیو شیتل میں شروع دن سے یعنی ۱۸۸۹ء اور ۱۸۶۶ء میں یونیورسٹیاں ہی قائم ہوئیں ۔ ان سب کا اہتمام جرمن یونیورسٹیوں کے انداز میں کیا گیا ہے ۔ یعنی ہر صوبہ ان کے انتظامات اور اخراجات کا ذمہ دار ہے ۔ نیز یہ کہ ہر یونیورسٹی کا سربراہ ایک ریکٹر ہوتا ہے جس کا منصب وائس چانسلر کے برابر ہوتا ہے ۔ ہر یونیورسٹی کی ایک سینیٹ بھی ہوتی ہے ، جس کے

اراکین منتخب ہوتے ہیں ۔ ہر یونیورسٹی میں چار فیکلٹیاں ہوتی ہیں جو دینیات ، قانون ، فلسفہ یعنی علوم و فنون اور طب سے متعلق ہیں ۔ ۱۸۵۵ء میں زیورخ میں فنیات کا ایک وفاقی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں اس وقت چھ سو انیس اساتذہ اور سات ہزار پینسٹھ طلبہ ہیں ۔ لوزین کا فنیات کا انسی ٹیوٹ ۱۹۴۶ء سے بالکل خود مختار ہے ۔ اس میں اس وقت ایک سو پچانوے اساتذہ اور ایک ہزار آٹھ سو اٹھارہ طلبہ ہیں ۔ علاوہ ازیں ۱۸۹۹ء میں اقتصادیات اور معاشرتی علوم کا ایک ادارہ قائم ہوا جس میں اس وقت ایک سو اکیاون اساتذہ اور ایک ہزار سات سو اکہتر طلبہ ہیں ۔ مذکورہ بالا یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں میں طلبہ اور کل اساتذہ کی تعداد حسب ذیل ہے :

| یونیورسٹی | دینیات | قانون | اقتصادیات | طب | علوم و فنون | اساتذہ |
|---|---|---|---|---|---|---|
| بازل | ۱۴۳ | ۵۴۳ | ۴۸۱ | ۱۵۲۹ | ۲۲۵۱ | ۴۴۴ |
| زیورخ | ۱۴۱ | ۱۴۶۰ | ۱۲۳۰ | ۲۳۴۹ | ۵۱۴۵ | ۱۲۴۰ |
| برن | ۱۰۸ | ۹۵۷ | ۶۵۱ | ۱۵۹۱ | ۳۰۰۷ | ۶۲۱ |
| جنیوا | ۸۰ | ۶۵۰ | ۸۸۶ | ۱۲۱۸ | ۴۱۷۹ | ۱۱۰۱ |
| لوزین | ۶۴ | ۶۶۶ | ۷۹۰ | ۱۰۹۷ | ۱۷۲۸ | ۴۳۹ |
| فرائی برگ | ۲۶۶ | ۳۶۷ | ۶۵۵ | ۳۰۸ | ۱۸۰۳ | ۲۷۰ |
| نیوشیٹل | ۴۹ | ۱۸۲ | ۲۴۵ | ۴۷ | ۱۰۶۲ | ۳۵۲ |

ان طلبہ میں طالبات کی تعداد شامل ہے ۔ البتہ جو غیر ملکوں سے تعلیم پانے آتے ہیں ، ان کی تعداد علیحدہ ہے ۔

میں نے ان اعداد و شمار کو حیرت اور دل چسپی کے ساتھ دیکھا ہے ۔ میں ان معاملات میں موازنہ اپنے پیارے وطن کے حالات سے کرتا ہوں ، اور ایسا سوچنا فطری امر ہے ۔ اور

ایسا اس لئے بھی ہے کہ میں پاکستان کے نظام تعلیم اور اس کی روح سے بڑا ہی غیر مطمئن ہوں ۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ پاکستان کے نظام تعلیم کو نظریۂ حیات ملی سے ہم آہنگ کرنے میں کیا امر مانع ہے ۔ اور یہ سوچتا ہوں کہ اس کے بغیر پاکستان اپنا تشخص کیونکر برقرار رکھ سکے گا ۔ اس سے قطع نظر تعلیم و تعلم کی جس روح کی حاجت ہے وہ موجود نہیں یا اسے تعلیم برائے تعلیم یا تعلیم برائے معاش کا درجہ حاصل ہے ، مگر تعلیم برائے تعمیر کا وجود نہیں ہے ، مرکز میں اور نہ صوبوں میں ۔ اب میں سوئزر لینڈ میں تعلیم کا نقشہ کھینچتا ہوں ۔

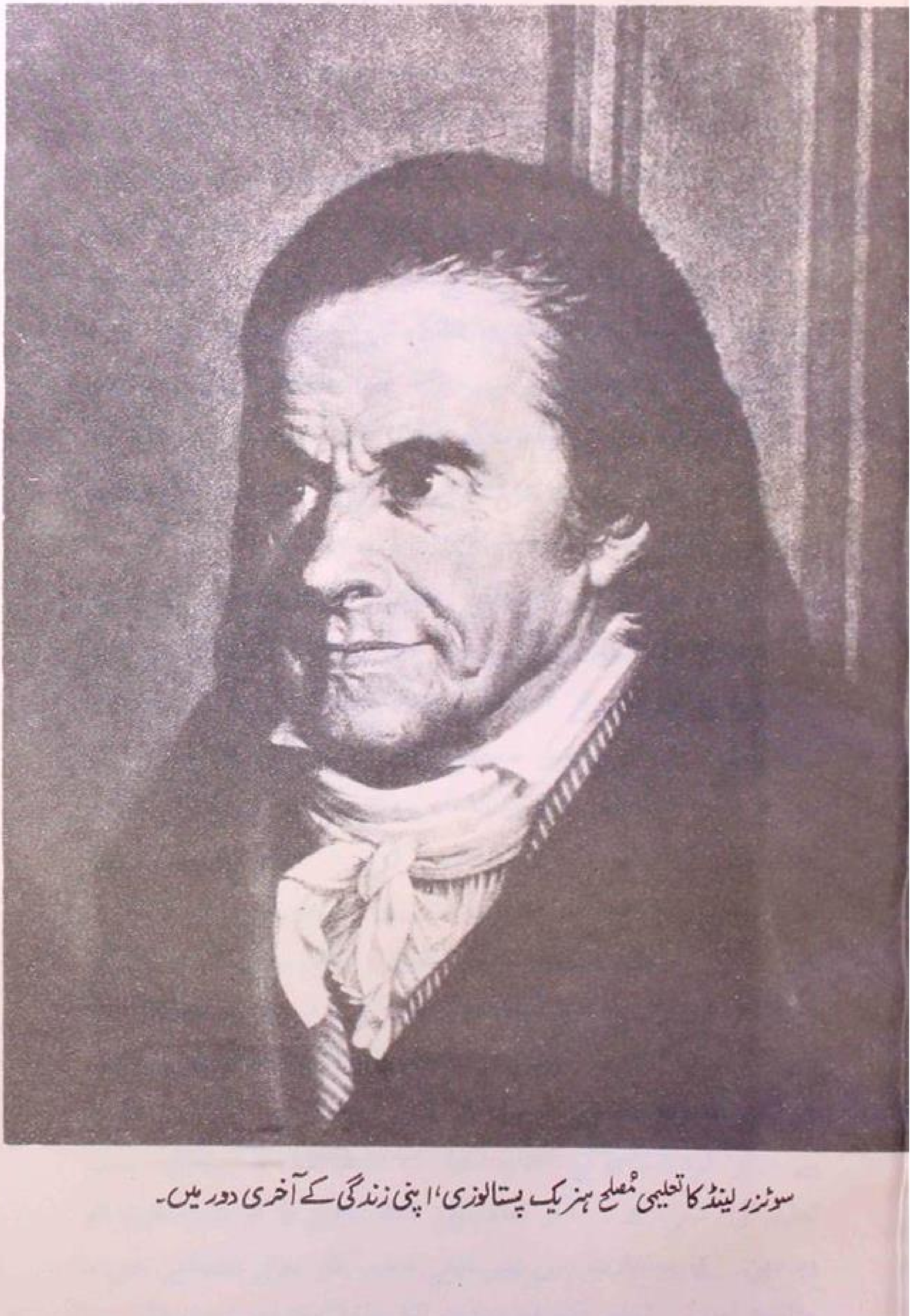
سوئزر لینڈ کا بڑا تعلیمی نظام ایک ریاستی معاملہ ہے جس کا وفاق سے بہت کم واسطہ ہے ۔ ۲۹ مئی ۱۸۷۴ء کو جب سوئزر لینڈ کا آئین منظور ہوا تو اس کی دفعہ ۲۷ کے تحت ابتدائی تعلیم کے لئے ریاستوں کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا ۔ چنانچہ اب ابتدائی تعلیم انھی کے اختیار میں ہے اور لازمی ہے ۔ بالکل مفت بھی ہے ۔ اسکولوں میں تمام مذاہب کے ماننے والے بچے شریک ہوتے ہیں لیکن ایسی کوئی کارروائی نہیں ہوتی جس سے ان کی مذہبی آزادی یا عقائد پر کوئی اثر پڑے ۔ تعلیمی نصاب میں بڑا تنوع ہے ، جس میں جغرافیائی ، تہذیبی اور ثقافتی روایات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔ اقلیتوں کے حقوق کا بطور خاص لحاظ رکھا جاتا ہے تاکہ مجموعی طور پر سب باشندوں کے خیالات اور میل جول میں ہم آہنگی ممکن ہوسکے ۔ اگر ان دو نکات کو نظر انداز کر دیا جاتا تو ریاست اور کلیسا کے درمیان کشمکش شروع ہوجاتی اور سلسلہ لامتناہی رہتا ۔ اس کے علاوہ اور بھی اختلافات رونما ہوتے جو سیاسی یا قانونی اعتبار سے بھی دور نہ ہوسکتے ۔ پھر چار زبانوں کا اختلاف بھی اپنا رنگ دکھاتا ۔ میں نے ہمیشہ اپنی اس

رائے کا اظہار کیا ہے کہ تمام عالم اسلام میں نصاب تعلیم میں یکسانیت پر غور کرنا چاہیے اور ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے تا کہ عالم اسلام میں فکری یک رنگی اور فکری ہم آہنگی پیدا ہوسکے ۔ یہ تو عالم اسلام کی بات ہے ۔ ہمارے ہاں تو چار صوبوں میں ہنوز یک رنگی پیدا نہیں کی جاسکی ہے ۔ بھلا بتائیے کہ اس کے بغیر باہمی تعاون اور سب پاکستانی ہیں کا جذبہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے ۔

سوئزر لینڈ کے بیشتر بچے ابتدائی اسکول میں داخل ہونے سے پہلے نرسری اسکول میں داخل ہوتے ہیں جہاں مونٹیسوری طریقۂ تعلیم کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے ۔ تاہم جنیوا کے سوا کسی اور صوبے میں یہ تعلیم لازمی نہیں ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ماں باپ خود ہی اپنے بچوں کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں ۔ نرسری میں داخلے کے لیے بچے کی عمر چار اور چھے سال کے درمیان رکھی گئی ہے ۔

ایسے بعض اسکولوں میں خصوصاً جہاں جرمن زبان بولی جاتی ہے ، ایک اور ماہر تعلیمات فروئل کے طریقۂ تعلیم کو اپنایا گیا ہے ۔ بہت سے نرسری اسکول نجی ملکیت کے بھی ہیں مگر انہیں بھی تعلیمی بورڈ کی ہدایات پر عمل کرنا ہوتا ہے ۔

سات سال بعد بچوں کو پرائمری اسکول میں داخلہ مل جاتا ہے ۔ وہاں بچوں کو نو یا دس سال کی عمر تک رہنا پڑتا ہے ۔ اس اثنا میں اساتذہ کو بچوں کے رجحان طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ لہذا ان کی سفارش کے بموجب ان کو ثانوی تعلیم دی جاتی ہے ۔ البتہ اگر والدین کے منصوبے مختلف ہوں تو وہ اپنی رائے کے مطابق عمل کراسکتے ہیں ۔ ثانوی تعلیم کے بعد تقریباً دس فیصد بچے اسکول چھوڑ کر اپنے والدین کے کاروبار میں



سوئٹزر لینڈ کا تعلیمی مُصلح ہنریک پستالوزی، اپنی زندگی کے آخری دور میں۔

تربیت حاصل کرنے لگتے ہیں اور مزید دس فیصد کو پیشہ ورانہ اسکولوں میں داخلہ مل جاتا ہے جہاں مدت تعلیم چار سال ہوتی ہے۔ دیہی علاقوں میں زرعی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ تا کہ بچے بڑے ہوکر اپنے والدین کے ساتھ کھیتی باڑی کے کاموں میں لگ جائیں۔ طالبات کے لئے بہت سی گھریلو دستکاریوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تا کہ وہ خانگی امور میں اچھی طرح حصہ لے سکیں۔ اس دوران میں سب طلبہ اور طالبات کے لیے مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کی تعلیم کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے تا کہ وہ ملک کے کسی بھی علاقے میں کسی مقصد سے چلے جائیں تو انہیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔

سوئزر لینڈ میں ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کا سہرا یوھان ھنریخ پستالوزی کے سر ہے۔ میں پستالوزی میوزیم میں کئی بار گیا ہوں اور میں نے اس علمی شخصیت کے بارے میں اور اس کے ماحول کے بارے میں سمجھنے کی کوشش کی ہے یہاں آکر میں نے ہمیشہ یہ غور کیا ہے کہ آخر ہم مسلمان کیوں اپنے ماھرین تعلیم کے نظریات پر فکر و غور نہیں کرتے۔ تعلیم کے میدان میں ابن خلدون نے کیا کم رہنمائی دی ہے! پھر آخر ہم پاکستان میں مانٹے سوری نظریہ تعلیم کیوں اپناتے ہیں؟ پستالوزی ١٧٤٦ء میں زیورخ میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے درس دینیات سے اپنی تعلیم کی ابتدا کی، لیکن بہت جلد رائج الوقت مذاھب سے بد دل ہوگیا۔ خصوصاً عیسائی فرقوں کی باھمی چپقلش نے اسے دینی تعلیم سے بیزار کردیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اختلافات کا بنیادی سبب تعلیم کی کمی ہے۔ اگر تمام بچے اعلا تعلیم پا کر بڑے ہوں تو وہ دین کے معاملات میں بھی اپنے شعور کو بہتر بناسکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے تعلیم کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا اور اس منزل میں

اپنی توقعات سے زیادہ کامیاب رہا ۔ اس نے نادار بچوں کے لئے مفت تعلیم کا اہتمام کیا جس کی ذمہ داری بعد میں حکومت نے اپنے سر لے لی ۔ تعلیم کے ضمن میں اس کے نظریات اتنے مقبول ہوئے کہ نہ صرف سوئٹزر لینڈ میں بلکہ ساری دنیا میں انہیں مقبولیت حاصل ہوگئی ۔ اس نے تعلیم کے ضمن میں کتب نصاب پر بھی خاص توجہ دی ۔ اس نے قصے کہانیوں کے ذریعہ سے معاشرتی اصلاح پر زور دیا ۔ ان قصے کہانیوں میں صرف گل و بلبل اور پریوں ھی کا ذکر نہیں ھوتا تھا بلکہ اکابرین ملک کے حالات کو دلچسپ اور جاذب توجہ انداز میں قلم بند کرایا گیا ، تاکہ بچے ان سے سبق حاصل کرسکیں ۔ نوجوانوں کے لئے اس نے سائنسی تعلیمات پر زیادہ زور دیا، کیونکہ اس ضمن میں صلاحیت و استعداد کے بغیر زندگی کے کسی شعبے میں ترقی حسب منشا نہیں ھوسکتی ۔ اس طرح جو اصول و قواعد اس نے منضبط کئے وہ آج تک حقیقت پسندانہ سمجھے جاتے ھیں اور ان کے مطابق عمل ھوتا ھے ۔ پستالوزی ژین ژاک روسو کے فلسفیانہ خیالات سے بے حد متاثر تھا ۔ روسو کوئی بڑا ماھر تعلیمات نہ سہی ، لیکن بلند پایہ مفکر تھا ۔ اس کی زندگی میں مذھب کے علمبردار اس کے خلاف ھوگئے تھے ، لیکن دوسرے طبقات میں اس کی قدر و منزلت ھوتی رھی اور آج تک علمی دنیا میں اس کی صلاحیت و استعداد کا لوھا مانا جاتا ھے ۔ اس نے اپنی کتاب ” اعترافات ،، میں اپنی زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کی ھے اور ایسی صداقت سے کام لیا ھے جس کی مثال مشکل سے ملتی ھے ۔ پستالوزی ابتدائی تعلیم کے ضمن میں روسو کے خیالات کا رھین منت رہا ھے ۔

ملک کے زیادہ متمول افراد اپنے بچوں کی اعلا تعلیم اور پھر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا اہتمام کرتے ھیں ، کیونکہ وہ



ژین ژاک روسو آرٹسٹ کی نظر میں۔



ژین ژاک روسو۔

نہ تو اپنے بچوں کو بہت جلد ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ھیں اور نہ انکے معیار کو پست رکھنا چاہتے ھیں ۔ ان کی یہ دلیل بھی قابل غور ہوتی ھے کہ طلبہ اور طالبات اعلا ترین تعلیم کے بعد ھی ملک و ملت کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوسکتے ھیں ۔ میں نے ان معلومات کو بڑی توجہ سے نوٹ کیا ، اور صورت حال پر پاکستان کے حالات کی روشنی میں غور کیا ۔ میرا تاثر یہ ھے کہ پاکستان میں صاحبان اقتدار نے جس طبقے کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا ھے اور بعد میں اس کو ملعون اور مردود قرار دیا ھے وہ متمول طبقہ ھے ۔ اگر صاحبان اقتدار اپنی فکری صلاحیتوں سے کام لیتے تو صاحبان دولت کو تعلیم سے دل چسپی لینے پر متوجہ کیا جاسکتا تھا اور یہ قطعی طور پر ممکن تھا ۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ اس میدان میں جو نقوش قائم بھی ہوئے تھے ان کو التزام کے ساتھ مٹایا گیا ھے ۔

## تربیت اساتذہ :

کم سے کم ھائی اسکول کی تعلیم کے بعد ھی اساتذہ کی تربیت ممکن ہوتی ھے ۔ انہیں ان کی تعلیمی قابلیت و صلاحیت کے اعتبار سے تدریسی تعلیم و تربیت دی جاتی ھے ۔ جمنازیم یعنی ورزش گاہ کی تربیت سب کے لئے لازمی ہوتی ھے ۔ اس طرح اساتذہ اور طلبہ دونوں کو صحت مند زندگی بسر کرنے کے مواقع میسر آسکتے ھیں ۔ تحریری پرچوں کے مطابق امتحانات لئے جاتے ھیں ، لیکن زبانی امتحانات کو بھی خاص اھمیت دی جاتی ھے ۔ اس میں کامیابی کے بغیر کوئی سند نہیں ملتی ۔ صنعت و تجارت یا زراعت کی تربیت کے لئے لازمی ہوتا ھے کہ طلبہ و طالبات اپنی اپنی درسگاھوں کے زیر اھتمام کسی صنعتی یا تجارتی ادارے یا زرعی فارم میں جاکر عملی تربیت حاصل کریں . اس کے بغیر انہیں سند نہیں

ملتی ۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ ہونہار طلبہ و طالبات کو فارغ التحصیل ہوکر سند پاتے ہی اچھے روزگار مل جاتے ہیں ، کیونکہ ان اداروں یا فارموں کو تربیت پانے والوں کی صلاحیت و استعداد اور کارکردگی کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے ۔

تعلیم و تربیت کے دوران میں اگر اساتذہ کسی طالب علم کے بارے میں محسوس کریں کہ وہ غیر معمولی طور پر زیادہ کند ذہن ہے یا تعلیم و تربیت سے جی چراتا ہے یا قدرتی طور پر ایسا معذور ہے کہ عام طالب علموں کی طرح تعلیم و تربیت حاصل نہیں کرسکتا ہے تو اسے نفسیاتی علاج کے ادارے یا معذور بچوں کے اسکول میں داخل کردیا جاتا ہے ، تاکہ سب سے پہلے نفسیاتی اعتبار سے اسکی اصلاح ہوسکے ۔ اس ضمن میں والدین کی مرضی برائے نام لی جاتی ہے ، کیونکہ ایسے مسائل کو قومی اعتبار سے جانچا جاتا ہے ۔ یہاں یہ نکتہ انتہائی قابل غور ہے ۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر ایسے طلبہ کو مایوسی کے عالم میں چھوڑ دیا جاتا ہے ۔ وہ یا تو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں یا وہ ماں باپ کی عدم توجہ کا شکار ہوتے ہیں ۔ اگر ہمارے ہاں صحیح اعداد و شمار موجود ہوں تو ہمارے وطن میں ایسے معذور بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے اور یہ بچے تعلیم و تربیت سے یکسر محروم ہیں ۔ ان کے لئے زندگی میں حصہ لینے کا کوئی سامان نہیں ہے ۔ تعلیم و تربیت کے بیشتر اداروں نے طلبہ و طالبات کی آمد و رفت کے لیے سواری کا انتظام کر رکھا ہے اور بعض دوپہر کا کھانا بھی فراہم کرتے ہیں ۔ والدین کو اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں ۔ اکثر طلبہ کو وظائف بھی ملتے ہیں ۔ ان کی دو قسمیں ہیں ۔ اول ناداری کی بنیاد پر اور دوسرے کسی خاص صلاحیت کے اظہار پر ۔ مخیر حضرات انہیں عطیات بھی دے

سکتے ھیں ، جو پہلے ممنوع تھے لیکن ۸ مئی ۱۹۶۳ء کو وفاقی آئین میں جو ترمیمات ھوئیں ، ان کے بموجب ان کا جواز مل گیا۔

فارغ التحصیل ھونے کے بعد بعض امنگوں بھرے نوجوان تحقیقاتی اداروں میں داخلہ لے لیتے ھیں اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے خاص کارنامے انجام دیتے ھیں۔ حکومت انکی سرپرستی کرتی ھے۔ تحقیقاتی کاموں کی کوئی مدت مقرر نہیں ھوتی بلکہ وہ اسکی نوعیت اور صورت حالات پر منحصر ھوتی ھے۔ اس ضمن میں ھر تحقیقاتی ادارے کی اپنی لائبریری ھوتی ھے۔ پبلک لائبریریوں سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ھے۔ اس زمانے میں زیادہ تر سائنسی علوم سے متعلق تحقیقات پر پوری توجہ دی جاتی ھے۔

## شعبۂ طبیعیات

جب ھم جامعۂ برن کے شعبۂ طبیعیات میں پہنچے تو موسم میرے نقطۂ نظر سے مجموعی طور پر بڑا ھی خوش گوار تھا۔ کچھ کہر ، کچھ بادل ، قدرے ٹھنڈی ھوا۔ کہیں کہیں سورج جھانک رھا تھا۔ بارش تو نہیں ھوئی تھی تاھم درختوں ، پودوں بیلوں کے پتے بھیگے ھوئے معلوم ھورے تھے۔ سبزہ زار پر بھی کچھ موتی سے چمک رہے تھے۔ غرض مجموعی طور پر ماحول بڑا اچھا تھا۔ اگر میں شاعر ھوتا تو موسمی کیفیات اور اپنے تاثرات کو ظاھر کرنے کے لئے دو تین نظمیں ضرور لکھ دیتا۔ اردو شاعری کا پس منظر انھی کیفیات سے ترکیب پاتا ھے۔ میں نے یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ میرے خون میں اوکسیجن کی مقدار بڑھ رھی ھے ، جو سراسر موسمی کیفیات کا اثر تھا۔

علم طبیعیات کا تعلق مادے اور توانائی سے اور ان کے باھمی ارتباط سے ھے۔ ھر شے کی پیمائش ، وزن ، حرارت ، قوت اور ان کو مربوط کرنے والے قدرتی ماحول سے اس کا گہرا تعلق ھے۔

سوئزر لینڈ کے ماہرین طبیعیات کے اکثر نظریات ساری دنیا کے لئے مشعل راہ بنے ہیں ۔ روشنی ، آواز اور مقناطیسی قوت بھی اس کے دائرہٴ عمل میں ہیں ۔ علم طبیعیات اور علم کیمیا میں جو قریبی تعلق ہے اس کی وضاحت بھی سب سے پہلے اس ملک کے علما نے کی تھی ۔ ان حقائق کے پیش نظر جب میں نے جامعہٴ برن کے شعبہٴ طبیعیات کا معائنہ کیا تو ان بہت سے حقائق کو بچشم خود دیکھا ، جن کا مطالعہ اس وقت تک صرف کتابوں کے ذریعہ سے ممکن ہوا تھا ۔ مثلاً ایٹمی طاقت کے رموز سمجھنے میں یہاں کے علما نے بڑا بھرپور قدم اٹھایا ، بال کی کھال نکالی اور اصلیت کو پوری طرح سمجھ لیا ، لیکن اپنی امن پسند طبیعت کے زیر اثر ایٹم بم بنانے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس سلسلے میں دوسری طاقتوں کو صلاح و مشورے دیے ۔ انہیں ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ اگر شرپسند ملکوں کو اس پوشیدہ طاقت کا کھلا علم ہوگیا تو وہ اسے تعمیری کاموں کے بجائے تخریبی کاموں میں زیادہ استعمال کرینگے ۔

جامعہٴ برن کے شعبہٴ طبیعیات میں پہنچنے پر جناب محترم پروفیسر آندرے مرسیئر صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا ۔ گزشتہ شب کھانے پر ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی ، بلکہ یہی ہمارے میزبان تھے ۔ بنیادی طور پر ماہر طبیعیات ہیں ۔ عالمی شہرت اور مقبولیت کے مالک ہیں ۔ جامعہٴ برن کے ریکٹر ( وائس چانسلر ) رہ چکے ہیں ۔ اب شعبہٴ طبیعیات کے صدر ہیں ۔ ریاضی سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کا خاص موضوع ہے ۔ انہوں نے مجھ سے پاکستان میں منعقد ہونے والی عالمی کنگرس علوم ریاضی کے بارے میں تبادل خیال کیا اور اپنی شرکت کا ارادہ ظاہر کیا ۔ انہیں معلوم تھا کہ میں یونیسکو اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اس عالمی و علمی اجتماع کے لئے

دعوت نامے بھیج چکا ہوں ۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں نے اب تک تقریباً ایک ہزار ماہرین علوم ریاضی کو اس کنگرس کے بارے میں اطلاع دی ہے ۔ مگر میں اس وقت تک صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اس میں شریک ہونے والوں کی تعداد کتنی ہوگی ۔ محض قیاس لگایا ہے کہ شاید تیس غیر ملکی اور پچاس سے پچپن تک پاکستانی ماہرین اس میں شریک ہونگے ۔ یہ یقین ہے کہ وہ سب کے سب اعلا استعداد کے حامل ہونگے ۔ معمولی شد بد کے لوگوں کو کسی بھی علمی اجتماع میں شریک کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوتا ، کیونکہ اس طرح غیر علمی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور جو حقیقتاً یکتائے روزگار ہوتے ہیں ، ان کو منتظمین سے خاصی شکایت ہوجاتی ہے ۔

پروفیسر مرسیٹر نے اپنی شرکت کا واضح اشارہ کردیا ۔ علوم ریاضی سے ان کو خاص شغف حاصل تھا ۔ اس لیے اس موضوع کی کسی بھی بین الاقوامی کنگرس میں ان کی موجودگی کی نشان دہی ہوسکتی ہے ۔ میرا موقف بھی یہ تھا کہ اگر یہ اجتماع پاکستان میں ہورہا ہے تو اس میں دوسرے ممالک کے نمائندے زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں ۔ ایسے جلسوں کا بنیادی مقصد محض ”نشستند و گفتند و برخاستند،، نہیں ہوتا بلکہ اس طرح گفت و شنید اور تبادل خیالات سے افہام و تفہیم کی راہیں کھلتی ہیں اور علم کے میدان میں ”کچھ لے اور کچھ دے،، کے انداز میں سیکھنے سکھانے کا موقع ملتا ہے جو علوم کی ترقی کا باعث بنتا ہے ۔

میں نے پروفیسر صاحب پر ہوائی ٹکٹ کے بارے میں اپنی مجبوریوں کے ساتھ صحیح بات واضح کردی ۔ میں نے بتادیا کہ غیر ملکی زرمبادلہ کا مسئلہ ہمارے ہاں موجود ہے ، جس نے

بعض لحاظ سے مشکلات بھی پیدا کی ہیں ۔ اس لئے ہم پاکستان میں آپ کے میزبان بن جانے کی حد تک تعاون کا وعدہ کرینگے ۔ باقی معلومات دوسرے دن تک فراہم کردی جائینگی تا کہ ان کی روشنی میں وہ اپنا آخری فیصلہ کرسکیں ۔

سفارت خانہ پاکستان کی موٹر ہم کو لینے کے لیے جامعہ برن نہیں پہنچ سکی ۔ موٹر کے عین وقت پر خراب ہوجانے سے لے کر پہلے سے طے شدہ اس کی دوسری مصروفیات تک مختلف وجوہ ہوسکتی تھی ، لیکن یہ معلوم کر کے انتہائی تعجب ہوا کہ موٹر ڈرائیور کو جامعہ کا راستہ نہیں مل سکا یہ سن کر کہ ڈرائیور کو جامعہ کا راستہ نہیں مل سکا میری بیٹی سعدیہ نے اس صورت حال پر یہ طنز کیا کہ ہمارے سفارت خانے والوں کو یونیورسٹیوں سے بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے !

اس باب میں میرا انداز فکر ہمیشہ ہی غیر متبدل رہا ہے ۔ میری رائے یہ ہے کہ پاکستان کو اپنے سفارت خانوں کی تشکیل میں اور کارکنان کے انتخابات میں زیادہ سے زیادہ محتاط ہونا چاھئیے ۔ بے شک سفارت خانے سیاست ہیں ۔ مگر اس سیاست کو اگر علم سے ہم آغوش کردیا جائے تو فوائد کی کثرت کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ ہمارے سفارت خانوں کو ان ممالک کے اھل علم سے رابطہ قائم کرنے کے قابل ھونا چاہیے ۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے کہ جب سفارت کار خود اھل علم ھوں اور علم و عالم کے قدردان ھوں ۔ ایسے ھمہ عالم عالموں سے تعلق اور ربط و ضبط پیدا کرسکتے ھیں ۔ جہلا یہ فریضہ ھرگز انجام نہیں دے سکتے ۔ مجھے اس میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں ہے کہ اھل علم اور صاحبان فضل سے تعلق و ربط ھمارے سفارتی فرائض میں زیادہ معاون ھوسکتا ہے اور یہ تعلق علمی روابط دائمی کا سبب بن

سکتا ہے۔

## ظہرانہ سفیر پاکستان

ڈاکٹر مرسیٹر کی موٹر میں ہم سب ساڑھے بارہ بجے سفیر کبیر پاکستان جناب محترم جنرل محمد یوسف خاں کی جائے رہائش یعنی سفارت خانے کی عمارت پر پہنچ گئے۔ ان کی ڈیوڑھی میں مہمانوں کی کتاب رکھی تھی۔ اس پر انگریزی الفاظ میں لکھا تھا: " ظہرانہ بہ اعزاز حکیم محمد سعید "۔ مہمانانِ گرامی اس کتاب پر اپنے دستخط ثبت کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ ملاقات قطعی نجی انداز کی ہوگی، مگر موصوف نے اسے سفارتی رنگ دے دیا جو خلاف توقع تھا۔ اس طرح جنرل صاحب نے بڑا کرم فرمایا کہ اس حقیر فقیر کو عزت بخشی۔ اس مجلس میں بہت سے اہم لوگوں سے ملنے کا موقع بھی مل گیا۔

کئی ممالک کے سفرا اور ان کی بیگمات مدعو کی گئی تھیں۔ پاکستانی حضرات و خواتین میں جناب اکبر خاں، جناب نعیم صاحب اور ان کی بیگمات تھیں۔ عملے کے دوسرے سفارتی افراد کو بھی بلایا گیا تھا۔ غرض مجموعی طور پر بڑا نفیس اجتماع تھا۔ جامعۂ برن کے وائس چانسلر صاحب بھی آئے تھے۔ نیز سوئس فاؤنڈیشن کے صدر جناب نوشر بھی شریک محفل تھے۔ جامعۂ برن کے بہت سے پروفیسر بھی تھے۔

ظہرانے کے آخر میں خود جنرل صاحب نے ہمارے کئی گروپ اور تنہا فوٹو گرافس لیے۔ یہ ان کا ذاتی شوق اور مشغلہ تھا۔ سفارت خانے کی طرف سے سرکاری فوٹو گرافر نے جو تصاویر کھینچیں وہ ان کے علاوہ تھیں۔

نجی بات چیت میں خاصا وقت گزارنے کے بعد ہماری واپسی کا پروگرام بنا۔

## پروفیسر برگل کے علم کدہ میں

پروفیسر برگل صاحب اور ان کی شریک حیات کی خواہش تھی کہ ہم ان کے گھر چلیں اور کچھ دیر نجی گفتگو رہے ۔ ان کی بات ٹالی نہیں جاسکتی تھی ۔ وہ جس خلوص سے ملتے تھے اس کا جواب اسی طرح دیا جاسکتا تھا کہ ان کی بات مان لی جائے۔ یوں بھی ہم اس ملک میں آرام طلبی کے لئے نہیں آئے تھے ۔ مطالعہ ، مشاہدہ اور تبادل خیال کے ذریعہ سے معلومات میں اضافہ ہمارا مقصد سفر تھا ۔

جناب سفیر صاحب نے اپنی گاڑی عطا فرمادی اور ہم برن یونیورسٹی سے شہر کے مضافات میں کوئی سات آٹھ میل دور نکل کر برگل صاحب کے گھر پہنچ گئے ۔ بہت عمدہ عمارت تھی ۔ سامان آرائش بھی خوب تھا ۔ ہر چیز سے خوش ذوقی اور علمی فضا کا اظہار ہوتا تھا ۔ ان کے دو بڑے پیارے بچے تھے ۔ ہم جب گھر میں داخل ہوئے تو بچوں کی نانی اماں ان کو الگ کمرے میں لیے بیٹھی تھیں اور بچے بڑے انہماک کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں مصروف تھے ۔ ہم پر نظر پڑی تو وہ کسی قدر متعجب سے ہوئے ۔ میرا اور بچیوں کا لباس ان کی نگاہ میں بالکل عجوبہ تھا ۔ شاید انہوں نے پہلے کسی کو اس طرح ملبوس نہیں دیکھا تھا ۔ اس حیرت اور استعجاب کے باوجود وہ دوبارہ اپنے مطالعے میں مشغول ہوگئے ۔ دل خوش ہوگیا ۔ بچوں کے اس کمرے میں بھی ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی نظر آئی ۔ بے ترتیبی کا کوئی مظاہرہ نہیں تھا ۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ بچوں کو تربیت دی گئی تھی کہ جو چیز جہاں رکھی ہے استعمال کے بعد وہیں رکھا کریں ۔ کتابیں اور کاپیاں تک بکھری ہوئی نہیں تھیں ۔



(اوپر دائیں طرف سے)

مسٹر برگل۔ خانم ڈی سلوا۔ ماسٹر برگل۔ مس فاخرہ الیاس۔ حکیم محمد سعید۔ مسز سعدیہ راشد

(نیچے دائیں طرف سے)

مسز برگل۔ خانم ڈی سلوا۔ ماسٹر ٹیری ڈی سلوا۔ مس فاخرہ الیاس۔ مسز سعدیہ راشد۔ ماسٹر برگل
حکیم محمد سعید۔



میں نے زیادہ وقت پروفیسر برگل کے کمرۂ مطالعہ میں گزارا ۔ وہاں مختلف زبانوں کی مختلف موضوعات کی کتابیں اتنی تعداد میں رکھی تھیں کہ ایک اچھی خاصی لائبریری معلوم ہوتی تھی ۔ زیادہ کتابیں انگریزی زبان میں تھیں جنہیں میں بڑے شوق سے دیکھ سکتا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ تاریخ ، فلسفہ اور ثقافت ان کے خاص موضوعات ہیں ۔ مختلف مذاہب کی کتابیں ان کی فراخدلی کا ثبوت تھیں ۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی تعصب کے بغیر اپنے مبلغ علم میں اضافے کے خیال سے مطالعہ کرتے تھے ۔

یہ غنیمت ہے کہ دوران گفتگو انہوں نے میرے ملک کی سیاست کے بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا ۔ البتہ ثقافتی موضوعات زیر بحث آتے رہے ۔ موئنجو ڈڑو اور ٹیکسلا کے کھنڈرات ان کے لیے باعث دلچسپی تھے ۔ وہ پاکستان کے آثار قدیمہ کے بارے میں شاید مارشل کی کتاب پڑھ چکے تھے ۔ ان کے گھر میں بھی مہمانوں کی ایک کتاب رکھی تھی جس میں وہ آنے جانے والوں سے ان کی رائے قلمبند کراتے تھے ۔ میں نے بھی احتراماً چند سطریں لکھ دیں جن میں ان کے اور ان کی شریک حیات کے حسن اخلاق کو سراہنے کے علاوہ بہ حیثیت مجموعی قومی کردار کی تعریف کی گئی تھی ۔

آخر میں برگل صاحب، نے پیانو بجایا ۔ میری بیٹی سعدیہ اور خانم ڈی سلوا کو پیانو سے خاص شغف ہے، لیکن مہارت دونوں میں سے کسی کو نہیں ہے ۔ اسلیے اپنی اس صلاحیت کا اشارتاً بھی اظہار نہیں کیا ۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر ان سے اظہار فن کے لئے کہا گیا تو ان کے کم استعداد ہونے کا راز کھل جائیگا ۔ مسز برگل بھی اس موقع پر خاموش نہ رہ سکیں ۔ انہوں نے ایک انگریزی گیت سنایا جس کے زیر و بم کی ایمائی کیفیات بڑی مسحور

کن تھیں - مجھے بھی داد دینی پڑی - یہ ہماری انتہائی خاطر تھی جو وہ کرسکتے تھے -

---

سفارت خانۂ پاکستان کی موٹر نے ۴ بجے واپس ہوٹل پہنچا دیا - اس موٹر کے پاکستانی ڈرائیور سے بات کرکے بڑی خوشی ہوئی - اس نے بہت قلیل مدت میں جرمن زبان اچھی طرح بولنی شروع کردی ہے - میں نے اس کو داد دی کہ اس نے زبان سیکھ کر اپنے لیے ایک مقام پیدا کرلیا ہے - اس کے برعکس ہمارے سفارت خانوں کے بعض افسران بھی دوسرے ملکوں میں سفارتی عہدوں پر کام کرتے ہوئے انگریزی زبان کے سوا مقامی زبان شاذو نادر ہی سیکھتے ہیں - چونکہ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان بن گئی ہے اور برصغیر میں انگریزوں کے عہد سے اس زبان کی تعلیم رائج ہے اس لیے اس میں استعداد پیدا کرنا کوئی کمال کی بات نہیں ہے - وہ جو کہا جاتا ہے کہ " آپ روم جائیں تو رومیوں جیسا رہن سہن اختیار کریں "، شاید ہمارے بہت سے سفارت کاروں کے پیش نظر نہیں ہوتا - اس کمی کو میں نے کئی ملکوں میں جا کر محسوس کیا ہے - آخر روس ، جرمنی یا سوئٹزرلینڈ میں جا کر صرف انگریزی زبان کو کیوں ذریعۂ اظہار بنایا جائے!

---

میں نے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر کچھ تھکن سی محسوس کی - میں وطن مالوف میں روزانہ کم و بیش سولہ گھنٹے کام کرنے کا عادی ہوں ، لیکن اس دوران میں بیشتر وقت کرسی پر یا کبھی کبھی زمین پر بیٹھ کر گزرتا ہے - میں عادتاً زمین پر

بستر بچھوا کر سوتا ہوں ۔ یہ میری صحت کے لئے مفید ہے ۔ اس صورت میں نیند آنے سے قبل تقریباً تین گھنٹے اپنے فرائض منصبی انجام دیتا ہوں ۔ یہ کام زمین پر ہوتا ہے ۔ لیکن اس سفر کے دوران میں زیادہ تر چلنا پھرنا پڑا ۔ لوگوں سے ملاقاتیں رہیں ۔ اس صورت میں تھکن کا ہونا عین ممکن تھا ۔ لہذا اس کسلمندی کو دور کرنے اور پرسکون نیند لانے کے لیے میں نے گرم پانی سے غسل کرلیا ۔ یہی مناسب تھا ، ورنہ میرا معمول ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا ہے ۔ اس کے لئے سردی گرمی کی کوئی تخصیص نہیں ۔ سخت جاڑے کے دنوں میں پہاڑی مقامات پر حتیٰ کہ چین اور روس جیسے سرد ملکوں میں بھی میں نے ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا ہے ۔ میں وضو بھی پانچوں وقت ٹھنڈے پانی سے کرتا ہوں ۔

گرم پانی نے میرے اعضا کو سکون بخشا ۔ اعصاب صحیح حالت میں آگئے ۔ اس طرح طبیعت ہلکی ہوگئی ۔ میں نے محسوس کیا کہ اب رات کو نیند اچھی طرح آئیگی اور سونے سے قبل جو کام کرنے ہیں وہ بھی کرسکونگا ۔ بچیوں نے اور خانم ڈی سلوا نے بھی اپنے اپنے کمرے میں پہنچ کر گرم پانی ہی سے غسل کیا ۔ وہ سب بھی تھکن محسوس کررہی تھیں ۔ ہمہ وقت میرے ساتھ رہی تھیں ۔

## تقریر کے لئے تیاری

میں نے اپنی ابتدائی اور اختتامی تقریروں کو ایک بار پھر پڑھا ۔ مکرر مطالعہ سے چند اچھی باتیں ذہن میں آئیں ۔ متن میں ان کا اضافہ کرلیا گیا ۔ مقالے کا درمیانی حصہ میں نے مسز ڈی سلوا کے حوالے کردیا ۔ میں نے صدر جلسہ سے خصوصی اجازت لے لی تھی کہ کچھ حصہ وہ پڑھ دینگی ۔ میرے لیے ایک گھنٹہ مقرر

کیا گیا تھا۔ مسلسل ایک گھنٹے میں پورا مقالہ پڑھنا میرے لیے ذرا دشوار تھا۔ میں بہت تیزی اور عجلت کے ساتھ پڑھنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس صورت میں بہت سے سامعین بیان ہونے والی سب باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ اس لیے میں الفاظ پر زور دے کر نسبتاً آہستہ پڑھتا ہوں۔ کچھ حصہ سکریٹری کے سپرد کردینے سے سانس لینے کا موقع مل جاتا ہے۔

میں نے اپنے مقالے میں کچھ کتر بیونت بھی اس طرح کی کہ مطلب زیادہ واضح ہوجائے۔ یہ ذرا مشکل کام تھا۔ یورپ کی ایک بڑی جامعہ میں ایسے سامعین کو خطاب کرنا تھا جو اسکالر تھے۔ اگرچہ موضوع ان کے لیے تقریباً نیا تھا۔ شاید ان میں سے کسی نے بھی اس کا عمیق مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو رکھتے تھے۔ اس لیے الفاظ کو بولنے سے پہلے اچھی طرح تولنے کی ضرورت تھی، تا کہ ابہام کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ یہ میرا امتحان نہین تھا اور نہ مقابلے کا مذاکرہ تھا، بلکہ میں طب مشرقی کا مسئلہ اس عالمی مجلسں میں اس طرح پیش کرنا چاھتا تھا کہ شرکائے اجلاس اس کی اھمیت کے قائل ہوجائیں۔ کتر بیونت کے بعد جو مضمون بچا وہ ایک گھنٹے کا تھا۔ ابتدائی اور آخری حصہ نصف گھنٹے کا تھا۔ اس کی ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی۔ باقی حصہ مسز ڈی سلوا کے سپرد کردیا گیا۔ یہ کام بہت ضروری تھا۔ اسے مکمل کرکے مجھے بڑا اطمینان ہوگیا۔

## جامعۂ برن میں

جامعۂ برن میں ہم سب چھے بجے پہنچ گئے۔ پروفیسر برکل ازراہ کرم ذرا پہلے تشریف لے آئے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے جامعہ کے وائس چانسلر (ریکٹر) سے ملایا۔ پھر ثقافت کے

پروفیسر صاحب کے دفتر میں لے جایا گیا ۔ وہ میرے منتظر تھے ۔ انہوں نے آب سنگترہ سے تواضع کی ۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ میں اور میرے ساتھی مے نوشی سے اجتناب کرتے ھیں ۔ وھاں آنے یا پہلے سے موجود لوگوں کی تواضع شراب سے کی گئی ۔ بہت سے پروفیسر وھاں جمع ہوگئے تھے ۔

۶ بج کر ۱۴ منٹ پر ہم کنفرنس ھال میں داخل ہوگئے ۔ میرے ساتھ سفیر پاکستان جناب جنرل محمد یوسف صاحب بھی تشریف لے آئے ۔ ھال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ھوا تھا ۔ پروفیسر برگل صاحب کی رائے تھی کہ ۲۰ اسکالرز بھی جمع ہوجائیں تو اسے کامیاب ترین مجلس کہنا چاھیئے ، مگر آج یہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ اسکالرز جمع تھے ۔ اس غیر معمولی اجتماع سے پروفیسر موصوف کو میزبان بلکہ محرک کی حیثیت سے بڑی ھی خوشی تھی اور مجھ میں بھی اعتماد پیدا ھوا کہ میرے لیکچر کے لئے اتنا بڑا اجتماع ھوا ھے ۔ بلاشبہ یہ موضوع کی جاذبیت تھی جس نے مقناطیس کا کام کیا اور شائقین علم کو بڑی تعداد میں کھینچ بلایا ۔ یورپ میں طب مشرق کی آواز اس انداز میں پہلی بار بلند ہوئی ھے ۔ یعنی مستشرقین نے اس موضوع پر کتابیں تو لکھی ھیں اور وہ کتابیں یقیناً علمی تحقیقات کی روح ھیں ، لیکن اجتماعات میں اس طریق علاج کی خوبیاں بیان نہیں کی گئیں ۔ حتیٰ کہ سرسری تعارف سے بھی کام نہیں لیا گیا ۔ میں نے انتہائی رکھ رکھاؤ کے ساتھ اور خانم ڈی سلوا نے بھی پورے جماؤ کے ساتھ تقریر کی ۔

میں اپنا مقالہ اپنے ساتھ کراچی سے چھپوا کر لایا تھا ۔ یہ میں نے بہت ھی اچھا کیا ۔ اس کی طباعت و تیاری بھی اتنی اعلا تھی کہ جن حضرات کو یہ مقالہ ملا وہ اس کی تعریف کرتے رھے ۔ صرف ایک سو کاپیاں میرے ساتھ تھیں ۔ ان کا وزن پینسٹھ

پونڈ تھا ۔ ظاہر ہے کہ جملہ سامعین کو یہ مقالہ نہ مل سکا ۔ البتہ پروفیسر آبئی صاحب ( صدر سائنس کونسل ) نے چھپے مقالے لے لیے ، کیونکہ وہ اس موضوع پر اپنے اہل علم ساتھیوں سے ان کے مطالعے کے بعد تبادل خیال کرنا چاہتے تھے ۔

میں مجموعی طور پر ۳۰ منٹ تک بولا ۔ خانم ڈی سلوا کے ذمے جو حصہ تھا وہ انہوں نے ۲۵ منٹ میں ختم کرلیا ۔ اس مجلس کو سوا سات بجے ختم ہو جانا چاہئے تھا ۔ مگر دس منٹ زائد صرف ہوگئے ۔ میں نے بہت ہی اطمینان کا سانس لیا کہ میں نے طب مشرق کی آواز انتہائی احتیاط اور خوبی کے ساتھ یورپ کے ایک بڑے شہر میں اور ایک بڑی مغربی جامعہ میں اور ایک اچھے اجتماع میں بلند کی ہے ۔ لیکچر کے بعد بہت سے لوگوں نے مقالے کے سرورق پر میرے آٹوگراف بھی لیے۔ اس سے ان کی طب میں دلچسپی اور ذوق علمی کا پتہ چلتا ہے اور علم و عالم کی قدر دانی ظاہر ہوتی ہے ۔ یادگار کے اعتبار سے بھی یہ طریقہ پسندیدہ کہا جاسکتا ہے ۔ اب سے پچاس سال کے بعد مقالے کی اس کاپی کی بڑی اہمیت ہوسکتی ہے ۔ جب ڈاک کا ٹکٹ پچاس سال کے بعد اہمیت رکھتا اور قیمتی ہوجاتا ہے تو یہ علمی مقالہ اس سے بہتر قدروں کا حامل ہوگا ۔

وائس چانسلر صاحب اور سفیر پاکستان صاحب نے مجھے مبارک باد دی ۔ بہت سے دوسرے شائقین علم نے بھی اس کو سراہتے ہوئے مبارک باد پیش کی اور کہا کہ آپ نے طب کی تحقیق کا ایک نیا راستہ کھول دیا ہے ۔ میں نے قرآن مجید کی سورۃ اقراء باسم ربک الذی پر اپنی تقریر ختم کی تھی ۔ وہاں بیٹھے ہوئے حضرات نے جو عربی زبان اور قرآن پاک کے الفاظ سے واقف تھے ، اس انداز خطابت کو پسند کیا ۔

## عشائیہ سائنس کاؤنسل

آج سائنس کاؤنسل آف سوئزر لینڈ کے چیرمین جناب پروفیسر آبئی صاحب، کی طرف سے میرے اعزاز میں ڈنر تھا ۔ اس کا اہتمام انہوں نے برن کے ایک مشہور ریستوران میں کیا تھا ۔ اس میں بارہ تیرہ علما و فضلا شریک تھے ۔ دراصل اس ڈنر کا مقصد یہ تھا کہ مقالہ پڑھے جانے کے بعد اس پر تبادل خیال کیا جاسکے ۔ اس طرح مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک طب مشرق کے نقطۂ نظر ، اس کی خصوصیات اور افادیت پر مزید وضاحت کرنے کا موقع مل گیا ۔ چونکہ یہ ایک لحاظ سے نجی محفل تھی ، اس لیے میں نے زیادہ کھل کر بات کی ۔ میں نے واضح کردیا کہ مغربی طب صرف مریض کا علاج معالجہ کرتی ھے اور مشرقی طب مرض کے استیصال کے ساتھ مریض کی دائمی تندرستی کا خیال رکھتی ھے ۔ موخرالذکر کا موقف صرف یہی نہیں ھوتا کہ جو مرض لاحق ھے وہ دور ھوجائے بلکہ یہ معلوم کرنا بھی ھوتا ھے کہ مرض لاحق کیوں ھوا ۔ اس سبب کا ازالہ کردیا جائے تو مریض آئندہ اس علالت سے بچا رھتا ھے ۔ اس کا اعادہ نہیں ھوتا ۔

رات تقریباً ساڑھے دس بجے تک یہ محفل جمی رھی ۔ میں نے میزبان محترم کی خدمت میں ھدیہ پیش کیا جسے انہوں نے بخوشی قبول کرلیا ۔ انہوں نے میرے بارے میں ایک الوداعی تقریر بھی کی جس کا میں نے مناسب جواب دیا ۔

## معاوضۂ مقالہ

صبح کو جامعۂ برن جانے سے پہلے میرے پروگرام کی منتظمہ محترمہ ھان وتھیرچ نے مجھے دو سو پچاس سوئس فرانک

پیش کئے تھے جو میری تقریر کے آنریریم (اعزازیے) کے طور پر تھے - ایک سوئس فرانک چار پاکستانی رپوں کے برابر ہوتا ھے - گویا وہ رقم ایک ہزار رپے کے برابر ہوگئی - میں نے ساری رقم بڑے شکریہ کے ساتھ واپس کردی اور ان کو بتادیا کہ میں علمی خدمت کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتا - آج تک ایسا نہیں ہوا - اپنے ملک کے علاوہ بیرونی ملکوں میں بھی ہمیشہ ایسی پیشکشوں کو قبول کرنے سے احتراز کیا ھے - انہیں کیا معلوم تھا کہ شریف خانی اور ہمدرد خاندانی حکیم مریض کو دیکھ کر اور اس کا نسخہ لکھ کر کوئی فیس نہیں لیتے - خواہ یہ معائنہ اپنے مطب میں کیا جائے یا مریض کی رھائش پر - یہ عظیم خاندانی روایات ھیں ، جن کا پاس و لحاظ میں بدرجۂ اتم کرتا ہوں -

رقم واپس کرکے مجھے دلی اطمینان ھوا - میں نے جامعۂ برن کی طرف سے ٹکٹ کی پیشکش بھی شکریہ کے ساتھ واپس کردی تھی - ایک طرف کا ٹکٹ بھی پانچ ہزار روپے کا تھا - میں کراچی سے واپسی کا ٹکٹ لے کر روانہ ھوا تھا - آنے جانے کا ٹکٹ دس ہزار رپے فی کس تھا - گویا ھم چاروں کے ٹکٹوں کی مجموعی رقم چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی جو میں نے اپنی جیب سے خرچ کی تھی - فروغ علم کی منزل میں یہ قربانی اکھرتی نہیں ھے - اور میں تو مبلغ طب تھا - ایک ایسی طب کی تبلیغ کررھا تھا کہ جسے اس کے موجدوں یعنی عربوں نے ترک کردیا ھے اور میں نے اسے اپنے سینے سے لگایا ھے - اور یورپ میں اس کا آوازہ بلند کیا ھے - اس آوازۂ طب کو لوگوں کے کانوں سے گزار کر قلوب میں اتارنا میرا مقصد زندگی ھے - اس مقصد اعلا کے لیے میں ھر قسم کی قربانی کر سکتا ہوں اور کرتا ہوں -

خانم ڈی سلوا سے پروفیسر برگل صاحب نے کہا کہ حکیم صاحب نے جامعۂ برن کے اساتذہ اور دوسرے شرکائے اجلاس پر انتہائی اچھا اثر چھوڑا ہے اور آئندہ کے لئے اپنی راہوں کو صاف کرلیا ہے۔ وہ خود بھی میرے طرز عمل سے بہت خوش تھے۔ چونکہ وہ مجھے دعوت دینے کے محرک تھے، اس لئے انہیں یہ اطمینان تھا کہ ان کے تجویز کردہ مہمان کی جامعہ میں پذیرائی ہوئی، وہ کسی کے لیے بار نہ بنا۔

میں نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس طرح سرفراز ہونے کا موقع دیا۔ سوئس سائنس فاؤنڈیشن کی طرف سے جب مجھے نو سو فرانک کی رقم پیش کی گئی تو پروفیسر برگل صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ اسے قبول کرنے سے انکار نہ کیا جائے، کیونکہ یہ رقم سوئزر لینڈ میں سفر خرچ کے لئے ہے، معاوضہ علمی نہیں ہے۔ پھر سوئزر لینڈ جیسے امیر ترین ملک کی طرف سے پیشکش ہے۔ یہ آپ کو قبول کرلینی ہی چاہیئے، کیونکہ یہ ہر اسکالر کو دی جاتی ہے۔ میں نے قدرے غور کے بعد یہ رقم اپنے پاس رکھ لی۔ سوال پروفیسر صاحب کی دل شکنی کا بھی تھا۔ انہوں نے ایک سو فرانک یومیہ کے حساب سے مجھے رقم ادا کی تھی۔ پاکستانی اعتبار سے یہ رقم تین ہزار چھے سو روپے کے برابر ہوئی۔ پروفیسر برگل نے بتایا کہ یہ دراصل اس اہتمام کے جواب میں ہے جو ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے برگل صاحب کے سفر اور قیام و طعام کے لیے کیا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ یہ رقم بھی واپس کردوں، مگر مصلحت رکھ لینے میں تھی تاہم اسے خرچ کرنے کا سوال التوا میں رکھا گیا۔ ہاں میں نے یہ حتمی فیصلہ کرلیا کہ اس رقم کے بقدرمیں کتابیں جامعہ برن کو ہدیہ کروں گا۔ مگر میں نے اس سے زیادہ رقم خرچ کرکے جامعہ برن کے

شعبۂ اردو کو مکمل کردیا !

---

پروفیسر برگل صاحب ہمیں ہوٹل تک پہنچانے کے لیے ساتھ آئے ۔ ان کے علاوہ میزبان اور ان کی بیگم صاحبہ بھی ہمراہ آئیں ۔ وہ گیارہ بجے شب رخصت ہوئے ۔ میں ان تینوں کو ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے گیا ۔ ۱۱ بج کر ۱۶ منٹ پر ان کی گاڑی روانہ ہوئی ۔

رات کے بارہ بجے مجھے بستر پر لیٹنا نصیب ہوا ۔ میرے لیے یہ غیر معمولی وقت نہیں تھا ۔ البتہ خانم ڈی سلوا اور بچیوں یعنی سعدیہ اور فاخرہ کو ذرا زحمت ہوئی ۔

نماز عشاء کے بعد میں نے خدا تعالیٰ کا دلی شکر ادا کیا تھا کہ اس نے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا تھا ۔ اس نے علمی مرتبہ عالمی اعزاز کے ساتھ عطا فرمایا تھا ۔ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نظر انداز کردیتا ہے ۔

و تعز من تشاء و تذل من تشاء ، بیدک الخیر
یہی اس کی شان کریمی ہے ۔

* * * * *

آج ۱۳ فروری کی صبح بیدار ہوا تو طبیعت بالکل ہشاش بشاش تھی ۔ میں الحمدللہ طبعی نیند سوتا ہوں ۔ اکثر لوگ ، مشرق میں ہوں یا مغرب میں ، خواب آور گولیاں کھاتے ہیں اور قطعی غیر فطری اور غیر طبعی نیند سوتے ہیں ، اس لیے کبھی وہ چاق چوبند اور ہشاش بشاش نہیں رہ سکتے ۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا ۔ مشاہدات یہ ہیں کہ جو لوگ ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے ہیں ان کو ذیابیطس کی تکلیف نہیں ہوتی ۔ اور جو لوگ گرم پانی سے غسل کرتے ہیں اور آخر میں ٹھنڈا پانی ڈال لیتے ہیں ان کے اعصاب جوان ہوجاتے ہیں ۔ میں ان دونوں پر عمل کرتا ہوں ۔ کبھی یہ اور کبھی وہ ! نماز فجر ادا کی ۔ معمول کے مطابق تلاوت قرآن حکیم کی ۔ اس سے طبیعت پر زیادہ خوشگوار اثر پڑا ۔ ہوٹل کا ملازم انگریزی زبان کا ایک روزنامہ اور ایک ہفتہ وار اخبار دروازے کی تہہ درز میں سے اندر ڈال گیا تھا ۔ میں نے اٹھا کر نظر ڈالی ۔ روزنامے میں گزشتہ روز کی کنفرنس کی کارروائی خاصی تفصیل کے ساتھ شائع کی گئی تھی ۔ میرے تعارف نامے کے بعد مقالے کے چند اقتباسات بھی دیے گئے تھے ۔

## سوئس ہفتہ وار اخبار

ہفتہ وار اخبار میں ایک مضمون جاذب نظر تھا ۔ سوویت یونین میں پاکستان کے بارے میں جو مطالعہ ہوتا رہتا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ سوئزر لینڈ میں اس مقالے کا شائع ہونا محل نظر تھا ۔ شاید اس لیے کہ سوئزر لینڈ ہمیشہ غیر جانبدار رہا ہے ۔ وہ پاکستان اور سوویت یونین کا بیک وقت اچھا دوست رہا ہے ۔ میں نے اخبارات کی مزید کاپیاں بازار سے خرید کر اپنے پاس محفوظ کرلیں ۔

اس کے مطالعے سے پتہ چلا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد سے اب تک تقریباً اٹھائیس سال کی مدت میں پاکستان کے بارے میں جتنی کتابیں، کتابچے، مضامین، تبصرے اور تحقیقی مقالے سوویت یونین کے کسی بھی حصے میں شائع ہوئے تھے ان کی کتابیات (ببلیوگرافی) شائع کی جارہی ہے۔ اس کی ایک جلد ۱۹۷۳ء میں شائع ہوچکی تھی۔ اس کے بعد کا نیا مواد دوسری جلد میں شامل ہونے والا ہے۔ اس کا مختصراً ذکر کیا گیا تھا۔

اس سے نہ صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سوویت یونین میں پاکستان کے بارے میں مطالعے کا شوق بڑھ رہا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس دوست ملک کے تاریخی حالات اور موجودہ ترقی کے بارے میں وہاں کے عوام دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سوویت ماہرین پاکستانی معیشت کے بنیادی مسائل کے مطالعے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ حال ہی میں جو اہم تصانیف شائع ہوئی ہیں ان میں پاکستان کی معاشی ترقی کے عنوان سے ایک مقالہ بطور خاص قابل ذکر ہے جسے مصنفین کی ایک جماعت نے لکھا ہے۔ اس میں قومی صنعتوں کے فروغ کے بارے میں حکومت پاکستان کی حکمت عملی، چھوٹے نجی اداروں سے متعلق حکومت کی حوصلہ افزائی کے مسائل، ٹیکس کے نظام اور مختلف علاقوں کی معاشی ترقی کے علاوہ پاکستانی معیشت میں بیرونی سرمائے کی سرگرمیوں وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مصنفین کی مذکورہ بالا جماعت میں مستشرقین کے علاوہ تاشقند، باکو اور دوشنبہ (تاجیکستان) کے ماہرین بھی شامل ہیں۔ دیگر کتابوں میں پاکستان کی صنعتوں سے متعلق جناب آئر نیاز موئدا کی کتاب اور

پاکستان و جاپان کے معاشی تعلقات کے جائزے کے بارے میں جناب چنگیز عباسوف کی تصنیف شامل ھے۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کتابیں زیر ترتیب ھیں اور جلد شائع ھونے والی ھیں :-

۱۔ لیودمیلا آرستو واکی ''پاکستان کا ٹیکنیکل ذیلی ڈھانچہ''

۲۔ نوجوان اسکالر تاخور جیاروف کی ''صوبہ سرحد کی معیشت''

۳۔ سرگئی کامی نیف کی ''پاکستان کی معاشی ترقی''

میں جب روس گیا تھا تو خوب سیرت و صورت نوجوان سرگئی میرا معاون تھا ۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ یہ میرا بیٹا ھے ۔ میں اس سے بیٹے کی طرح ھی پیش آیا ۔ میں نے سرگئی کی کتاب کا مسووہ بھی دیکھا تھا جو نامکمل تھا ، مگر سرگئی کے استاد پروفیسر گینکافسکی اس کی رھنمائی کررھے تھے ۔ سرگئی اسی موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رھا ھے ۔

جو مقالے اشاعت کے لئے تیار کئے جارھے ھیں ، وہ پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی ، زرعی مسائل ، سرکاری مالیات اور دوسرے مسئلوں کے بارے میں ھیں ۔ شہرۂ آفاق مصنف جناب ریماشیر کودینا کے مضامین پاکستان کے بارے میں چھپتے ھیں ۔

پچھلے چند سال میں پاکستان کے موجودہ مسائل اور تاریخ کے بارے میں جو قابل ذکر کتابیں شائع ھوئی ھیں ، ان میں سے ایک ممتاز کتاب ''پاکستان کے تین آئین'' بھی شامل ھے ۔ اسے جناب ی ۔ گینکافسکی اور جناب و ۔ موسکا لینکو نے مشترکہ طور پر مرتب کیا ھے ۔ کتاب میں پاکستان کی آئینی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ھے ۔ آخری حصے میں ان مسائل سے بحث کی گئی ھے جن کا تعلق ۱۹۷۳ء میں منظور ھونے والے آئین سے ھے ۔ کتاب کا

دیباچہ جناب میخائیل کاپتسا نے لکھا ہے جو کئی سال تک پاکستان میں سوویت یونین کے سفیر رہ چکے ہیں۔ اب اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے۔

سوویت مستشرق جناب ر۔ مقیم ژانووا نے جو پاکستان کی خارجہ پالیسی پر تحقیقی مقالے لکھنے کے لیے مشہور ہیں، ''پاکستان، جنوبی ایشیا اور امریکی پالیسی،، کے عنوان سے ایک نئی کتاب قلم بند کی ہے جس میں ۱۹۶۰ء کے بعد سے پاکستانی امریکی تعلقات سے متعلق مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پاکستان کے بارے میں دو مجموعۂ مضامین بھی شائع ہوئے ہیں جو کہ ان سوویت صحافیوں نے لکھے ہیں جن کا کئی سال تک پاکستان میں قیام رہا ہے۔ ایک مجموعے کا نام ''ستروان سمت الراس،، ہے جسے و۔ ناکاریاکوف نے مرتب کیا ہے اور دوسرے کا نام ہے ''ماضی سے بغاوت،، جو کہ جناب ا۔ فلی پوف کے روزنامچے اور سفر نامے پر مشتمل ہے۔

پاکستان میں خواتین کی تنظیم اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں محترمہ صبیحہ مانا موواکی ایک کتاب زیر ترتیب ہے۔ عنقریب شائع ہوجائیگی۔

مذکورہ بالا کتابوں سے سوویت قارئین پاکستان کی تاریخ، ادب، فلسفے اور ثقافت کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوویت یونین کی اکیڈمی اوف سائنسز نے جو عالمی تاریخ شائع کی ہے، اس کی گیارھویں سے پندرھویں جلد تک ہر ایک میں پاکستان کا ذکر ایک ایک علاحدہ باب کی صورت میں کیا گیا ہے۔

سوویت یونین کی لائبریریوں میں مشرقی زبانوں کے جو قلمی نسخے محفوظ ہیں، ان کی اشاعت کے سلسلے میں سوویت

مستشرقین بڑی محنت کر رہے ہیں ۔ ان میں ایک کتاب جناب محمودالحسین کی لکھی ہوئی '' تاریخ احمد شاہی ،، ہے جس میں اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف حصے کی تاریخ کے بارے میں قیمتی معلومات درج ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب پاکستان کے مورخین کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی ۔ تاجیکستانی مستشرق جناب سعید مرادوف نے اس کتاب کی تدوین کی ہے ۔

حکیم الامت ، شاعر مشرق علامہ اقبال کے کلام کے بارے میں نتالیہ پریگارینہ کا نیا تحقیقی مقالہ حال ہی میں مکمل ہوا ہے ۔

حال ہی میں شائع ہونے والی کتابوں میں سے حوالہ جات کی ایک ضخیم کتاب '' پاکستان ،، کا تذکرہ ضروری ہے ۔ اسے چوبیس ممتاز سوویت دانشوروں نے ، جو پاکستانی مسائل کے خصوصی ماہر سمجھے جاتے ہیں ، مل کر تیار کیا ہے ۔ پانچ سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں پاکستان کی تاریخ ، معیشت ، تہذیب و ثقافت ، ادب ، مذہب ، آبادی اور دوسرے موضوعات کے بارے میں اہم معلومات شامل ہیں ۔

سوویت مستشرقین نے اسلام آباد یونیورسٹی ، کراچی یونیورسٹی ، سندھ یونیورسٹی ، پنجاب یونیورسٹی ، پشاور یونیورسٹی ، اقبال اکیڈمی ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور دوسرے اداروں اور انجمنوں سے وابستہ دانشوروں کے ساتھ قریبی رابطے قائم کیے اور حسب ضرورت مواد اکھٹا کیا ہے ۔ ان کے مقالات سوویت قارئین کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ پاکستان فہمی کے ضمن میں ان کی کاوشیں معاون ہوسکتی ہیں ۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہیگا ۔ سوئزر لینڈ کے اس ہفتہ وار اخبار میں یہ سب کچھ میں نے دل چسپی اور تشویش کے ساتھ پڑھا ۔ سوئزر لینڈ کے صحافی کسی

تعصب کے بغیر دوسرے ملکوں کے حالات کس قدر تفصیل سے چھاپتے ھیں - اس سے بہر حال مسرت ہوئی ھے -

برابر کے کمروں میں بیداری کے آثار پائے گئے تو میرا سلسلۂ خیالات منقطع ھوگیا - میں نے اٹھ کر معلوم کیا تو دوسرے کمرے میں میری سکریٹری خانم ڈی سلوا اور دونوں بچیاں سعدیہ اور فاخرہ اخبار کے مطالعے میں مصروف تھیں - ھوٹل کی طرف سے ان کے لیے بھی اخبارات مہیا کیے گئے تھے - گویا ھر کمرے میں اخبارات رکھنا ھوٹل کی ذمہ داری ھے -

## پابندیٔ وقت

برآمدے میں آمد و رفت سے پتہ چلا کہ ھوٹل کے ملازمین ناشتے کی ٹرالیاں لیے گھوم رھے ھیں - بہت سے مسافر اپنے ھی کمروں میں ناشتہ کرنا چاھتے ھیں - میں بھی اس طریقے کو نسبتاً بہتر سمجھتا ھوں - ھم لوگ ناشتے سے فارغ ھوئے ھی تھے کہ مادام مارگریٹا تشریف لے آئیں - مغرب میں عورت ھو یا مرد احساس فرض سے سرشار ھے - پابندیٔ وقت ان کی ایک حسین ادا ھے - ادائی فرض ان کا اصول ھے - خدمت ان کا جذبۂ مقدس ھے - تعاون و اشتراک اور مدد کرنا ان کا قابل تعریف عمل ھے - اس سب کی داد دیتا ھوں اور دعا کرتا ھوں کہ ھم کہ جنھوں نے ان روایات حسنہ کو ترک کردیا ھے ، اسی راستے پر چلیں -

مجھے بتایا گیا کہ برن سے جنیوا جانے کے لیے دو ریل گاڑیاں مناسب ھیں - ایک صبح ۸ بج کر ۴۳ منٹ پر اور دوسری ۹ بج کر ۴۴ منٹ پر چھوٹتی ھے - میں نے موخرالذکر کے ذریعہ سے سفر کا فیصلہ کیا اور اسی کے مطابق تیاری شروع کردی -

یہاں ٹرینوں کے اوقات کی بڑی پابندی ھوتی ھے - اگر آپ

کی اپنی گھڑی درست ہے اور صحیح وقت بتاتی ہے تو قطعی طور پر یہ وہی اسٹیشن ہوگا جہاں آپ اترنا چڑھنا چاہتے ہیں - یہاں پابندیٔ وقت کو زبردست اہمیت دی جاتی ہے - اگر ایسا نہ ہو تو یہاں نظم و نسق قائم نہیں رہ سکتا - درحقیقت ایفائے وعدہ، پابندیٔ وقت، قدر اوقات اور ایسے ہی اصول اسلام کی بنیادی تعلیمات کے جزو ہیں جن کو ہم نے بلکہ سارے عالم اسلام نے نظر انداز کر رکھا ہے اور اہل پاکستان نے تو شاید ان کے برخلاف عمل کرنے کی قسم کھالی ہے - ہمارے ہاں ریل تو ریل ہوائی جہاز تک وقت کے پابند نہیں ہوتے - میرا دل پیارے پاکستان کے لیے ہمیشہ دکھتا ہے - میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اب ایک انقلاب برپا ہو اور ہم اقوام عالم میں سر افتخار بلند کرسکیں - ایسا اس وقت ممکن ہے کہ جب ہم اسلام کے اصول و ضوابط کی پابندی کریں -

کل ہی کی تو بات ہے کہ جب چھے بج کر بارہ منٹ ہوگئے تو پروفیسر مرسیئر صاحب نے کہا، "حکیم صاحب! اب ہمیں دو منٹ بعد لیکچر ہال چلنا ہے" - چنانچہ سب لوگ اس وقت چل پڑے اور ٹھیک سوا چھے بجے ہم لیکچر ہال میں داخل ہوگئے - بلا تاخیر کارروائی شروع ہوگئی - میں نے غور کیا کہ "شام ہمدرد" کے جلسے، جن کا ہم حد درجہ اہتمام کرتے ہیں اور دعوتی کارڈ میں لکھا جاتا ہے کہ پابندیٔ وقت کا لحاظ رکھا جائے، وقت پر شاذ و نادر ہی ہوسکتے ہیں - مجھے اپنے طور پر بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ ذمہ داری محسوس کرنے والی چند ہستیاں وقت پر تشریف لے آتی ہیں اور انہیں خواہ مخواہ انتظار کرنا پڑتا ہے - بعض صورتوں میں مہمان مقررین تک وقت کی پابندی نہیں کرتے یا صدر صاحب غائب رہتے ہیں - ظاہر

ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں جلسے کا آغاز نہیں ہوسکتا ۔

وقت کی عدم پابندی زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر منزل میں نظر آئیگی ۔ اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں تک میں طلبہ پابندیٔ وقت کے ساتھ حاضر نہیں ہوتے اور اگر اساتذہ تنبیہ کریں تو فوراً احتجاج شروع ہوجاتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ٹریفک کے ناقص نظام کی وجہ سے پابندیٔ وقت کا لحاظ رکھنا ذرا مشکل ہوجاتا ہے ، لیکن اس کوتاہی کے پیش نظر اگر طلبہ گھروں سے نکلنے میں عجلت برتیں تو مقررہ وقت پر درسگاہوں میں حاضری ہوسکتی ہے ، لیکن تعلیم کو اگر دوسرے مشاغل کی طرح ایک دلچسپ مشغلۂ حیات سمجھ لیا جائے تو صحیح نظام کیسے ممکن ہو ۔

یہی نہیں ، اگر آپ کے علاقے میں چار مسجدیں ہیں تو پانچ پانچ دس دس منٹ کے وقفوں سے مختلف اوقات میں دی جانے والی اذانیں سنائی دینگی ۔ اس اعتبار سے نماز کے اوقات بھی یکساں نہیں ہونگے ۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک شخص گھر سے ذرا دیر میں نکلا اور قریب ترین مسجد میں نماز ہوگئی تو وہ دو قدم چل کر دوسری مسجد میں جاکر فریضہ ادا کرلیگا ۔ یہ دلیل ناقص نہیں ہے ۔ مگر میں طبعاً اس سے الجھتا ہوں ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایک وقت مقرر ہے تو ہر انسان کو اس کی پابندی کرنی چاہیئے ۔ مغرب کی اذان تو بہر حال ایک وقت مقررہ پر ہوتی ہے اور اللہ جن کو توفیق دیتا ہے وہ جماعت میں شریک ہو ہی جاتے ہیں ۔ ایسا ہر نماز کے لیے بھی اگر ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے ! اگر فلم دیکھنے کے لیے پابندیٔ وقت کے ساتھ گھر سے دور سنیما گھر میں پہنچا جا سکتا ہے تو رب العزت کے حضور سر جھکانے میں اس پابندی کا خیال کیوں نہیں رکھا جاسکتا ۔

سرکاری عدالت میں اگر کوئی ملزم یا گواہ وقت مقررہ پر نہ پہنچے اور اس کے نام کی آواز پڑ جائے تو وارنٹ جاری ہوجاتا ہے ۔ کیا اس لیے کہ عدالت خداوندی کا وارنٹ یوم حشر سے پہلے وصول نہیں ہوگا ، وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھا جاتا ؟ بہ ایں عقل و دانش بہ باید گریست ۔

گیارہ بج کر اکتالیس منٹ پر ہم برن جنیوا پہنچ گئے ۔ یہ دو گھنٹے جیسے منٹوں میں گزر گئے ۔ پورے راستے حسن و جمال کی ایک ایسی وادی نظر کے سامنے تھی جس میں انسان داخل ہوتے ہی دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوکر قدرت کی حمد و ثنا میں مصروف ہوجاتا ہے ۔ اس خطۂ ارض کو شاید قدرت نے اپنے دست اعجاز سے سنوارا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے بھی ایسے انسان یہاں پیدا کردیے ہیں کہ جو اس زیبائش کو برقرار رکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ، بلکہ اس میں اضافہ ہی کرتے ہیں کس قدر حسن پرست ہیں یہ لوگ !

## میرا پیارا وطن

سوئزر لینڈ کے باشندے فطرتاً جنگ جو نہیں ہیں ۔ میرا یہ تاثر بہر طور صحیح ہے ۔ ہر عالمگیر جنگ میں یہ ملک قہر خداوندی سے دور رہا ہے ۔ جنگ کا کوئی شعلہ اس تک نہیں پہنچ سکا ہے ۔ اس خطۂ ارض کی اسی خصوصیت کی بنا پر بہت سے عالمی اداروں کے مرکز یہاں قائم ہیں ۔ اسی جگہ مسائل صحت سے لیکر مسائل حقوق انسانی تک ہر پیچیدہ گتھی سلجھائی جاتی ہے ۔ دنیا بھر کے انسان اطمینان کے ساتھ یہاں جمع ہوجاتے ہیں ۔ فکر فردا اور اندیشۂ مستقبل دامن گیر نہیں ہوتا ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں کی فضا میں بڑی تازگی ہے ۔ آلودگی سے پاک ہے ۔ ملک اتنا سرسبز و شاداب ہے کہ فضا کی ہر

آلودگی ختم ہوجاتی ہے ۔ یہ سبزہ زار گویا پھیپڑے ہیں کہ فضا کو صاف کرتے رہتے ہیں ۔ یہ صاف و پاک فضا نظام جسم انسانی پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کرتی ہے ۔ فکر و عمل کا خلوص اس سے پیدا ہوتا ہے جو کثافت میں ہرگز ممکن نہیں ہے ۔ سلامتیٔ فکر نے یہاں خلوص و انس کا وافر سامان کیا ہے ۔ انسانی مزاج کثافت فکر اور آلودگیٔ عمل سے مبرا ہے ۔

میں برن سے جنیوا تک دوران سفر اس پہلو پر غور کرتا رہا کہ کیا یہ ممکن نہیں ہوسکتا کہ پاکستان اپنی حکمت عملی کی بنا پر خطۂ پاکستان کو تمام اسلامی ممالک کا مستقر بلکہ پناہ گاہ بنالے ۔ میرے پیارے اور خوبصورت وطن کو یہ جغرافیائی حیثیت حاصل ہے کہ وہ عالم اسلام کے لئے سوئزر لینڈ بن جائے ۔ اس کے جغرافیائی محل وقوع سے قطع نظر میرا پاکستان ایک خوبصورت خطۂ ارض بھی ہے ۔ یہاں پہاڑ ہیں ، سبزہ ہے ، وادیاں ہیں ، یہ دریاؤں اور بندوں کی سر زمین ہے ، یہاں قدیم ثقافتوں کے آثار موجود ہیں ۔ گرم و سرد اور معتدل علاقے بھی یہاں ہیں ۔ موسم کی کیفیات نت نئے رنگ جماتی ہیں ۔ بحری اور فضائی اڈے موجود ہیں ۔ آمد و رفت اور حمل و نقل کے ذرائع مختلف النوع ہیں ۔ لہذا یہ وسط ایشیا کا سوئزر لینڈ بن سکتا ہے اور عالم اسلام کے لئے آماجگاہ امن بھی ثابت ہوسکتا ہے ۔

سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان نام نہاد سیاسی امن سے دست بردار ہو کر عافیت کا صحیح راستہ اختیار نہیں کرسکتا ؟ سیاسی بازی گری نے آخر آج تک پاکستان کو کیا دیا ۔ ایک تجربہ یہ بھی کرنا چاہیئے کہ پاکستان ابن الوقتی سیاست سے دست بردار ہوکر آوازۂ امن بلند کرے ۔ یہ اعلان ہونا چاہیئے کہ وہ دنیا کے ہر ملک سے معاہدۂ دوستی کرنے کے لئے تیار ہے

اور اس معاهدے کا احترام خود کرے اور دوسروں سے کرائے۔ وہ اپنے پڑوسی ملکوں — ہندوستان ، افغانستان ، چین ، روس ، ایران ، اور ترکی سے ، نیز مشرق وسطیٰ کے تمام عرب ملکوں سے دوستی کی راہ استوار کر کے ایک سو سال جنگ نہ کرنے کا معاهدہ کرے ۔ اگر اس راستے پر قدم اٹھ گئے تو کم سے کم اس علاقے میں خرمن امن پر کوئی بجلی نہیں گر سکتی ۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچیگا ۔ عالم اسلام کے تمام نزاعی مسائل بھی یہاں حل ہوسکینگے ۔ اسلامی ممالک اپنا سرمایہ بے خوف و خطر یہاں لگا سکینگے ۔ اس سے فریقین کو یکساں فائدہ پہنچیگا ۔ اس سے اسلام کی نشاۂ ثانیہ بھی ہوسکیگی جو امن کا پیغامبر ہے ۔ مگر اس مقصد کے لئے ذوالفقار علی بھٹو صاحب موزوں انسان نہیں ہوسکتے ۔ ان کی سیاست دو عملی ہے اور اس لئے ناقابل اعتبار کہی جاسکتی ہے ۔ ان کے شریک کار بھی اس مسلک کے حامل ہیں ۔ ضرورت ہے کہ پردۂ غیب سے کوئی نئی شخصیت نمودار ہو اور ملک کی موجودہ ڈانوا ڈول کشتی کو طوفانی لہروں سے نکال کر لے جائے ۔

میرے دل کی بے قراری کا حال کوئی کیا جانے۔ پاکستان ہر حیثیت سے ایک عظیم ملک ہے ۔ یہاں ہر وہ چیز میسر و موجود ہے کہ جو عظمت و رفعت کے لیے ضروری ہے ۔ تعمیر کی یہاں راہیں کھلی ہوئی ہیں ۔ قدرت کی فیاضیوں کی یہاں کوئی حد ہے نہ بس ۔ بایں ہمہ یہاں کا ہر انسان قرض تلے دبا ہوا ہے ۔ غیر ملکی امداد نے بھیک کی شکل اختیار کرلی ہے ۔ اور اس صورت حال نے ہمارے ہر ہاتھ میں کاسۂ گدائی دیدیا ہے ۔ ہر انسان غیرت و حمیت سے محروم ہوگیا ہے ۔ محنت سے عاری اور جہد للبقا کے اعلا وصف سے محروم ہوگیا ہے ۔ لاریب ہماری فکری اور سیاسی

آزادی کے لیے یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے ۔

## پروہیلویتیا

ہم جنیوا پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروہیلویتیا نے ہوٹل لارینری ڈنس میں ہمارے قیام کا انتظام کرادیا ہے ۔

پروہیلویتیا ادارے کا آغاز سوئز وفاق کی نگرانی میں ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا ۔ دس سال بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں یہ ادارہ بجائے خود ایک فاؤنڈیشن بن گیا اور ۱۷- دسمبر ۱۹۶۵ء کے ایک وفاقی قانون کے ذریعہ سے ان فرائض کی وضاحت کردی گئی جو اس کے سپرد کیے گئے تھے ۔ وہ فرائض یہ ہیں :

۱- سوئزر لینڈ کی روحانی اور تہذیبی میراث کو برقرار رکھنا اور ملک کی بے مثل طرز زندگی کی خصوصیات کا تحفظ کرنا ،

۲- ریاستوں ، مختلف لسانی علاقوں اور ملک کے متعدد تہذیبی گروہوں کی مروجہ روایات کے سہارے سوئزر لینڈ میں تخلیقی جوہر کے اظہار کی ہمت افزائی کرنا ،

۳- ملک کے مختلف لسانی علاقوں کے درمیان تہذیبی تبادلے کو فروغ دینا ،

۴- دوسرے ملکوں سے تہذیبی تعلقات کو فروغ دینا اور ان میں بطور خاص سوئزر لینڈ کے دانشوروں اور فنکاروں کی تخلیقات کو سمجھنے کی تحریک پیدا کرنا ،

اس فاؤنڈیشن کو وفاقی حکومت سے معقول امداد ملتی ہے جبکہ وہ ایک خود مختار ادارہ ہے اور حسب ذیل تنظیموں پر مشتمل ہے :-

۱۔ فاؤنڈیشن کی انجمن ، جس میں پچیس ارکان ہوتے ہیں
ان کا تقرر وفاقی کونسل کرتی ہے ۔
۲۔ انتظامی انجمن ، اس کا عملہ حسب ضرورت رکھا
جاتا ہے ۔
۳۔ کارکن جماعتیں ، ان کی تعداد مقرر نہیں ہے ۔
۴۔ سکریٹریٹ ، جو مذکورہ بالا انجمنوں اور جماعتوں
سے رابطہ قائم رکھتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔

اس وقت پروہیلویتیا کے صدر ڈاکٹر ولی اسپوہلر ہیں اور سکریٹریٹ کے ڈائرکٹر مسٹر لک بوئسونا ہیں ۔ صدر دفتر زیورخ میں واقع ہے ۔ البتہ اس کی شاخیں ہر بڑے شہر میں ہیں تاکہ فرائض کی ادائی میں آسانی ہو ۔

## روایات اور رسم و رواج

سوئزر لینڈ کی روحانی اور تہذیبی میراث کو برقرار رکھنے اور ملک کے بے مثل طرز زندگی کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے کے لیے جو ادارہ وجود میں آیا ، وہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، اس صدی کی پیداوار ہے ، لیکن روایات اور رسوم ، جن کی پابندی کی جاتی ہے ، بے حد پرانی اور قدیم ہیں ۔ علمی تحقیقات کی بنیاد پر ان کا سیر حاصل تذکرہ تو اس وقت دشوار کام ہے ۔ صرف اختصار کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کی روایات کا بیشتر حصہ مشرق و مغرب کے بہت سے ملکوں کی طرح خزاں اور بہار سے متعلق صدیوں پرانی باتوں سے وابستہ ہے ۔ ان میں اپنے اسلاف کی پرستش اور زرخیزی کی التجا بھی شامل ہے ۔ عیسائیت سے پہلے کی یہ دونوں باتیں عیسائی مذہب کے فروغ کی وجہ سے اور تہذیب کی ترقی کے سبب بہت کچھ بدل چکی ہیں ، بلکہ آپس میں اس طرح مل جل گئی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل معلوم

ہوتا ہے کہ کون سی رسم اسلاف کی پرستش سے شروع ہوتی ہے اور کون سی زرخیزی کی التجا سے - ایک طرف ارواح کی ملامت کا خوف ذہن پر طاری رہتا ہے اور دوسری طرف فطرت کے شگون کی فکر دامن گیر ہوتی ہے - ان سے چھٹکارا پانے کے لئے مصنوعی چہرے لگا کر بعض رسوم ادا کی جاتی ہیں جو دوسروں کی نظر میں دقیانوسی ہوتی ہیں ، لیکن مقامی باشندوں کے لیے قابل تقلید ہیں - ان موقعوں پر جلوس نکالنے کے علاوہ عوامی رقص ہوتے ہیں جو مناظر کشی اور موسیقی کے اعتبار سے بڑے دلکش ہوتے ہیں - سوراخ کے ذریعہ سے بڑے بڑے کھوکھلے شلجموں میں شمعیں جلاکر جو جلوس نکالے جاتے ہیں ، انہیں " راپیلختلی ،، کہتے ہیں - دریاؤں کے کنارے پہنچ کر ان روشنیوں کو پانی کی لہروں میں بہادیا جاتا ہے - یہ روشنیاں تیرتی ہوئی دور نکل جاتی ہیں - ان کے اثر سے اسلاف کی ارواح خوش ہوتی ہیں اور وہ سال بھر تک کوئی تکلیف نہیں پہنچاتیں !

عیسائی خیالات فروغ پانے کے بعد سے ۱۱ ستمبر کو یوم سینٹ مارٹن منایا جاتا ہے - اس روز ہر شخص ایک ہنس کی قربانی دیتا ہے - کاٹے ہوئے ہنس کو ٹاؤن ہال کے سامنے وسیع میدان میں کھنچی ہوئی ڈوریوں میں لٹکا دیا جاتا ہے - اس موقع پر عام لوگ خصوصاً نوجوان سرخ لبادے پہنتے ہیں - وہ نقلی چہرے لگا کر اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر رقص کرتے ہیں - کم عمر لڑکے بھوسہ بھری ہوئی بوریاں کمر پر لاد کر دوڑ لگاتے اور نقلیں اتارتے ہیں - اس روز جو بازار لگتا ہے ، اس میں سب سے زیادہ پیاز کی خرید و فروخت ہوتی ہے - عقیدہ یہ ہے کہ پیاز کی جھل بدروحوں کو بھگانے کا موثر ذریعہ ہے - لڑکیاں بہت زرق برق اور رنگین لباس پہن کر میلے میں آتی ہیں - اس موقع پر

والدین اپنی اولاد کے لیے ازدواجی رشتے بھی طے کرلیتے ھیں ۔

۱۱ اور ۱۲ دسمبر کو بڑے شہروں کی دیواروں پر کمند لگا کر چڑھنے کی کوشش کی جاتی ھے ۔ اس طرح اس ناکام حملے کی یاد منائی جاتی ھے کہ جب سیوائے کے نواب نے عہد قدیم میں ملک کے صدر مقام پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی ، لیکن اھالیان شہر نے دیگوں میں ابلتا ھوا پانی فوجی سپاھیوں پر انڈیل کر انھیں پسپا کردیا تھا ۔ اب دیگوں میں گرم پانی کے بجائے نفیس چیزیں مثلاً چوکلیٹ ، کیک یا آئس کریم کے پیکٹ ھوتے ھیں جو بچوں پر نچھاور کردیے جاتے ھیں ۔ بچے ان تحائف کو لوٹتے وقت شور مچا کر سیوائے کے نواب کو برا بھلا کہتے ھیں ۔

اسی طرح نئے سال کی آمد پر جنیوا کے لوگ اپنی اس بحالی کی یاد تازہ کرتے ھیں جو ۱۸۱۴ء کے شروع میں نپولین بوناپارٹ کی فوجوں کو پسپا کرکے حاصل کی گئی تھی ۔ اس موقع پر بھی آزادی کا جشن منایا جاتا ھے ۔ اس میں رنگ برنگے لباس کے ساتھ رقص کرنا شامل ھے ۔

۱۵ فروری کو لوپرکس دیوتا کے احترام میں ایک جشن منایا جاتا ھے ۔ یہ یونانی دیوتا پین کے مساوی ھے ۔ اس روز نوجوان مرد چمڑے کے کوڑے نوجوان عورتوں کے محض رسمی طور پر مارتے ھیں ۔ اس کا مطلب یہ ھوتا ھے کہ شادی کے سلسلے میں ان کی مرادیں جلد برآجائیں ۔

۲۵ دسمبر کو تمام عیسائی دنیا کی طرح بڑا دن منایا جاتا ھے ۔ اس روز محض عیسائی عقیدہ رکھنے والے ھی نہیں بلکہ تمام باشندے خوشیاں مناتے ھیں ۔ اس روز دعا مانگی جاتی ھے کہ بہت جلد کہر اور بادل کی کیفیات ختم ھوں اور چمکتا ھوا سورج نکل آئے جس سے کھیت ھرے بھرے ھوتے ھیں اور پھلوں

میں رس زیادہ ہو جاتا ہے ۔

پرانے زمانے کے جرمن باشندے اپنے دو خوفناک دیوتاؤں یعنی اوڈن اور تھور کو گرجتے ہوئے بادلوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے اور ان سے رحم و کرم کی التجا کرتے تھے ۔ اس عقیدے کے تحت سوئزر لینڈ کے کسان اپنا اناج رکھنے کے کوٹھوں کے دروازے کھلے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ دیوتاؤں کی وحشی فوج بلا روک ٹوک ان میں داخل ہوسکے ۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان کوٹھوں کی چھت اڑ جائیگی اور اندر رکھا ہوا اناج ضائع ہوجائیگا ۔ چونکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کے ساتھ کچھ بھوت بھی آجاتے ہیں اس لیے ان کو ڈرا کر بھگانے کے لیے خوفناک نقلی چہرے لگا کر خوب غل مچایا جاتا ہے ۔ لڑکے اپنے اپنے گلے میں گائے کے گلے کی گھنٹیاں باندھ کر اچھلتے کودتے اور ڈھول بجاتے ہیں ۔ بچے اس موقع پر کالے لبادے اوڑھ کر کالے نقاب لگاتے ہیں تاکہ بھوت خود ڈر کر بھاگ جائیں ۔

ایک نہایت موثر جلوس کسناخٹ شہر میں نکالا جاتا ہے جو کچھ عرصے کے لیے متروک ہوگیا تھا ۔ مگر بیس پچیس سال سے اس کی تجدید ہوگئی ہے ۔ اسے کلوس جاگن کہتے ہیں یعنی سنٹ نکولس کا پیچھا کرنا ۔ آگ کے شعلے بھڑکا کر کان پھاڑنے والے غل و شور کے ساتھ ایک سمت میں بھاگا جاتا ہے ۔ نوجوان لڑکے کسانوں کی قمیص پہن کر چمڑے کے تسموں سے کسی ہوئی گھنٹیاں اٹھا کر چلتے اور انہیں زور زور سے بجاتے ہیں ۔ کچھ لوگ ناقوس کی طرح گائے کے سینگ بجا کر ان کا ساتھ دیتے ہیں ۔ بگل بجانے والوں کی دھن الگ اپنا رنگ جماتی ہے ۔ چرمی کوڑوں کو اس طرح جھٹکے دیے جاتے ہیں ، گویا رائفل کی گولیاں چل رہی ہیں ۔ کچھ لوگ ٹخنوں تک کی لمبی

قمیصیں پہن کر اور سن کی بڑی بڑی ڈاڑھیاں لگا کر اور سروں پر اسقف کی ٹوپیاں رکھ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ ان ٹوپیوں میں سوراخ ہوتے ہیں جن پر رنگین کاغذ کے ٹکڑے چپکا دیے جاتے ہیں تاکہ ٹوپیوں کے اندر بیٹری سے روشن ہونے والے بلب ان کو جگمگا دیں اور وہ رنگین کیفیات پیدا کریں ۔ یہ لوگ مسخروں کی طرح اچھلتے کودتے اور جلوس میں شامل دوسرے لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے جاتے ہیں ۔

کیتھولک فرقے کے لوگ ایسٹر کے موقع پر نصف شب کی عبادت بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں ۔ اس تقریب کی تجدید بھی کوئی بیس سال سے ہوئی ہے ، ورنہ یہ عرصہ دراز تک متروک رہی تھی ۔

ریاست شوئز کے علاقے میں ٦ جنوری کی سہ پہر کو مدرسوں کے بچے سفید رنگ کی کلاہیں پہن کر سڑکوں پر گھومتے ہیں ۔ کبھی اکیلے ہوتے ہیں اور کبھی ساتھیوں کے ہمراہ ۔ وہ تنہا یا مل جل کر روایتی " تین عقلمند آدمیوں ،، کا گیت گاتے ہیں ۔ وہ سڑکوں اور باغیچوں میں لگے ہوئے فواروں کے گرد رقص کرتے ہیں ۔ پھر گاتے بجاتے قریب کے کسانوں کے پاس جا کر تحفوں کی بھیک مانگتے ہیں ۔ انہیں چاکلیٹ اور کیک مل جاتے ہیں ۔ کچھ ٹکڑیاں نوجوانوں کی ہوتی ہیں ۔ وہ بھی سفید کلاہیں پہن کر گھومتے ہیں ۔ وہ گھنٹیاں بھی بجاتے جاتے ہیں ۔ کچھ مسخرے لمبی داڑھیاں لگائے ان کے ہمراہ ہوتے ہیں جو منظوم مکالمے دہراتے ہیں ۔ یہ مسخرے ان غلطیوں اور حماقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو سال بھر کے دوران بعض دانشوروں سے سرزد ہوتی ہیں ۔ ان میں طنز کا پہلو نمایاں ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی سرکاری افسران کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے ۔

۲ فروری کو جو حضرت مریم کے چلہ نہانے کا دن سمجھا جاتا ہے ، ایک جشن عیش و عشرت منایا جاتا ہے ۔ عام شہری اس روحانی اور طلسماتی رموز کی داد دیتے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے متعلق ہیں ۔ غیر کیتھولک علاقوں میں اس روز لوگ بھوت بن کر دندناتے پھرتے ہیں ۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو کوئی معجزہ نہیں سمجھتے ۔ ان کے شور و غل کی خرمستیاں بعض سنجیدہ لوگوں کے لیے وبال جان بن جاتی ہیں ، لیکن عقائد کے تضاد کے باوجود کوئی ہنگامہ یا فساد نہیں ہوتا ۔ تحمل اور بردباری سے کام لیا جاتا ہے ۔

نقاب پوش ہوکر یا مصنوعی چہرے لگا کر باہر نکلنے کا تعلق اس دیرینہ خوف سے ہے کہ لوگوں کے مرے ہوئے آبا و اجداد کی روحیں اپنے ہیبت ناک چہروں کے ساتھ دنیا میں واپس آتی ، اپنے اعزا کو ان کی کوتاہیوں پر ملامت کرتی اور جبراً اپنا حق وصول کرنا چاہتی ہیں ۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ ان کا خیر مقدم اسی انداز میں کریں تاکہ وہ پوری طرح کسی کو پہچان نہ سکیں ۔ زندہ لوگوں اور روحوں میں مصالحتی اشارے ہوتے ہیں اور وہ مطمئن ہوکر لوٹ جاتی ہیں ۔ قرون وسطیٰ کی عدالتوں کے بعض ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مصنوعی چہرے یا نقاب لگانے والے بدطینت افراد ، جن کا دراصل اپنے اجداد کی روحوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ، درپردہ تشدد پر اتر آتے اور اور بعض جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں ۔ البتہ ایسی وارداتیں شاذو نادر ہی ہوتی ہیں ۔ کلیسا نے اور حکومتوں کے ارباب اقتدار نے بھی کئی بار نقاب پوشی کی اس رسم کو ختم کرادینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی ۔

۱۳ جنوری کو قدیم جولین کلینڈر کے حساب سے نیا سال

شروع ھوتا ھے ۔ اس روز کیتھولک عقیدے کی بعض ریاستوں میں سر کو انوکھے طریقے سے ملبوس کرکے رقص کیا جاتا ھے ۔ اسے زیادہ تر لکڑی اور چھال سے تیار کرکے دھوئیں سے کالا کرلیا جاتا ھے ۔ اطالوی اثرات کے تحت جو لوگ ایسی ٹوپیاں استعمال کرتے ھیں ان میں گھنٹیاں بھی لگی ھوتی ھیں جو سر مٹکانے سے برابر بجتی رھتی ھیں ۔ ایسے رقص کے وقت نقاروں پر ضرب لگائی جاتی ھے جن کی آواز دور دور تک پھنچتی ھے ۔ ریاست ٹسینو میں ایسے موقع پر ابلے ھوئے چاول کی نذر پیش کی جاتی ھے ۔

دریائے رھائن کے ایک موڑ پر ، جو شھر بازل کے قریب ھے ، کیمیائی صنعتوں کے تاجر اور عالم خاص رسومات ادا کرتے ھیں ۔ وہ فینسی ڈریس میں جلوس نکالتے ھیں ۔ عیسائی عقیدے کے مطابق مذھبی جلسے کے بعد والی پیر کو صبح چار بجے تمام سڑکوں کی بتیاں گل کردی جاتی ھیں ۔ اس وقت کافی اندھیرا ھوتا ھے ۔ لوگ مصنوعی چھرے لگا کر اور لالٹینیں ھاتھ میں لے کر سڑکوں کا گشت کرتے ھیں ۔ ڈھول اور باجے بھی بجتے ھیں ۔ یہ سلسلہ طلوع آفتاب تک جاری رھتا ھے ۔ اس دوران میں وہ ایک دوسرے کو برا بھلا کھتے ھیں ۔ الفاظ کی یہ دلیرانہ جنگ صرف الفاظ تک محدود رھتی ھے ۔ کتنا بھی کسی کا مذاق اڑایا جائے ، کوئی ناراض ھوکر بدلہ لینے کے لیے تشدد آمیز حرکتیں نھیں کرتا ، بلکہ خاموشی کے ساتھ اس مذاق کو برداشت کرلیتا ھے ۔

موسم بھار شروع ھونے سے پھلے ھی اینگاڈین کی بلند وادیوں میں ، جو برف سے ڈھکی ھوتی ھیں ، مرد اور عورتیں بغیر پھیوں کی گاڑیوں میں سوار ھوکر گھروں سے باھر گھومنا شروع کردیتی ھیں ۔ اس طرح قدرتی مناظر کی دلکشی میں اور جان

پڑجاتی ہے - چھوٹے بچے گھنٹیاں بجاتے ہیں تاکہ سوئی ہوئی گھاس بیدار ہوجائے اور برف والی سفید زمین جلدی ہی سبز ہوجائے - کہیں کہیں اس مقصد کے لیے آگ بھی روشن کی جاتی ہے -

ریاست گلاریس میں جو نہایت قدیم رسم ادا ہوتی ہے، اسے طلسماتی کہا جاسکتا ہے - لڑکے لکڑی کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی گول ٹکیوں کو لوہے کی لمبی سلاخوں میں پرو لیتے اور پھر جلا ڈالتے ہیں - شعلے نکلتی حالت میں وہ ٹکیوں سمیت سلاخوں کو دور وادی میں پھینک دیتے ہیں - اس طرح وہ اپنی دانست میں ان مردود لوگوں پر حملہ کرتے ہیں جنھوں نے حضرت مسیحؑ پر ان کی زندگی میں طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھائے تھے -

زیورخ میں ایسٹر کے مہینے کسی پیر کے دن، جس کا اعلان ہوجاتا ہے، جاڑے کے شیطان کا جنازہ طنزیہ انداز میں نکالا جاتا ہے - تمام سڑکوں پر چکر دیدینے کے بعد اسے بڑے چوک میں جلادیا جاتا ہے - کچھ جماعتیں جنازے کو چکر نہیں دیتیں، وہ بارود اور پٹاخوں سے بھرا ہوا ایک بدھیبت پتلا بناتی ہیں اور اسے ہندوؤں کے انداز کی چتا پر رکھ کر آگ لگا دیتی ہیں - بارود جلتا ہے اور پٹاخے تیز آواز سے پھٹتے ہیں - اس طرح گویا بد روحیں سال بھر کے لیے شہر سے فرار ہوجاتی ہیں - پتلا جلنے کے دوران میں کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوکر چتا کے گرد چکر لگاتے ہیں اور خاص گیت گاتے ہیں -

موسم سرما کے بعد موسم گرما کی معاشرتی سرگرمیاں اور تفریحی دلچسپیاں بھی کچھ کم نمائشی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ ایک تہوار کی صورت اختیار کرلیتی ہیں - اس موقع پر پہلوانوں

میں کشتی کے مقابلے ہوتے ھیں - ان میں کشتی کا ایک خاص انداز ھے جسے اصطلاحاً " ھارنوسن "، کہتے ھیں - اس ضمن میں انسان کو ایک دیوقامت جھینگر کا حلیہ اختیار کرکے لڑنا پڑتا ھے - عوام اس پر پتھر بھی پھینکتے ھیں ، لیکن بہت چھوٹے اور آھستہ کہ ان سے کوئی تکلیف نہ پہنچے - بس وہ جھینگر کی کھال پر لگیں اور گرجائیں - اندر کے انسان کو معلوم بھی نہ ھوکہ کتنے پتھر کس طرف سے آئے - لوگ گھوڑوں پر سوار ھوکر مقدس مقامات کی زیارت کے لیے بھی نکلتے ھیں - موسم سرما میں وھاں شاذو نادر ھی کوئی جاتا ھے ، کیونکہ برفباری کے باعث وھاں کے راستے عموماً مسدود رھتے ھیں - وہ ایسی وادیوں میں واقع ھیں جو برف کے زمانے میں پٹ جاتی ھیں - اسی موسم میں ایک مصنوعی لڑائی بھی ھوتی ھے - لوگ پستول چلاتے ھیں جن میں سے گولیاں نہیں نکلتیں - اس طرح اپنی جنگ آزادی کی یاد منائی جاتی ھے - شامل ھونے والے لوگ تاریخی لباس بھی پہنتے ھیں جو اس وقت کے بہادر لڑنے والوں نے استعمال کیا تھا - شام ھونے پر ایسے ڈرامے اور فلم بھی دکھائے جاتے ھیں جو اسی لڑائی سے متعلق ھوتے ھیں -

ھمارے ملک میں مغرب زدہ نوجوانوں کا ایک خاص طبقہ قومی رسم و رواج کا مذاق اڑاتا ھے اور ان کی پابندی کرنے والوں پر قدامت پسندی کی پھبتیاں کستا ھے ، لیکن سوئزر لینڈ میں یہ انداز تمسخر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا - وھاں سنجیدہ لوگ بھی اپنی روایات کا احترام کرتے اور انہیں اپنی تہذیب و ثقافت کا جزو سمجھتے ھیں - ان رجحانات کو مدنظر رکھتے ھوئے سوئزر لینڈ کے عام باشندوں کے عادات و اطوار کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ھے - یہ اندازہ لگانا بھی آسان ھوجاتا ھے کہ

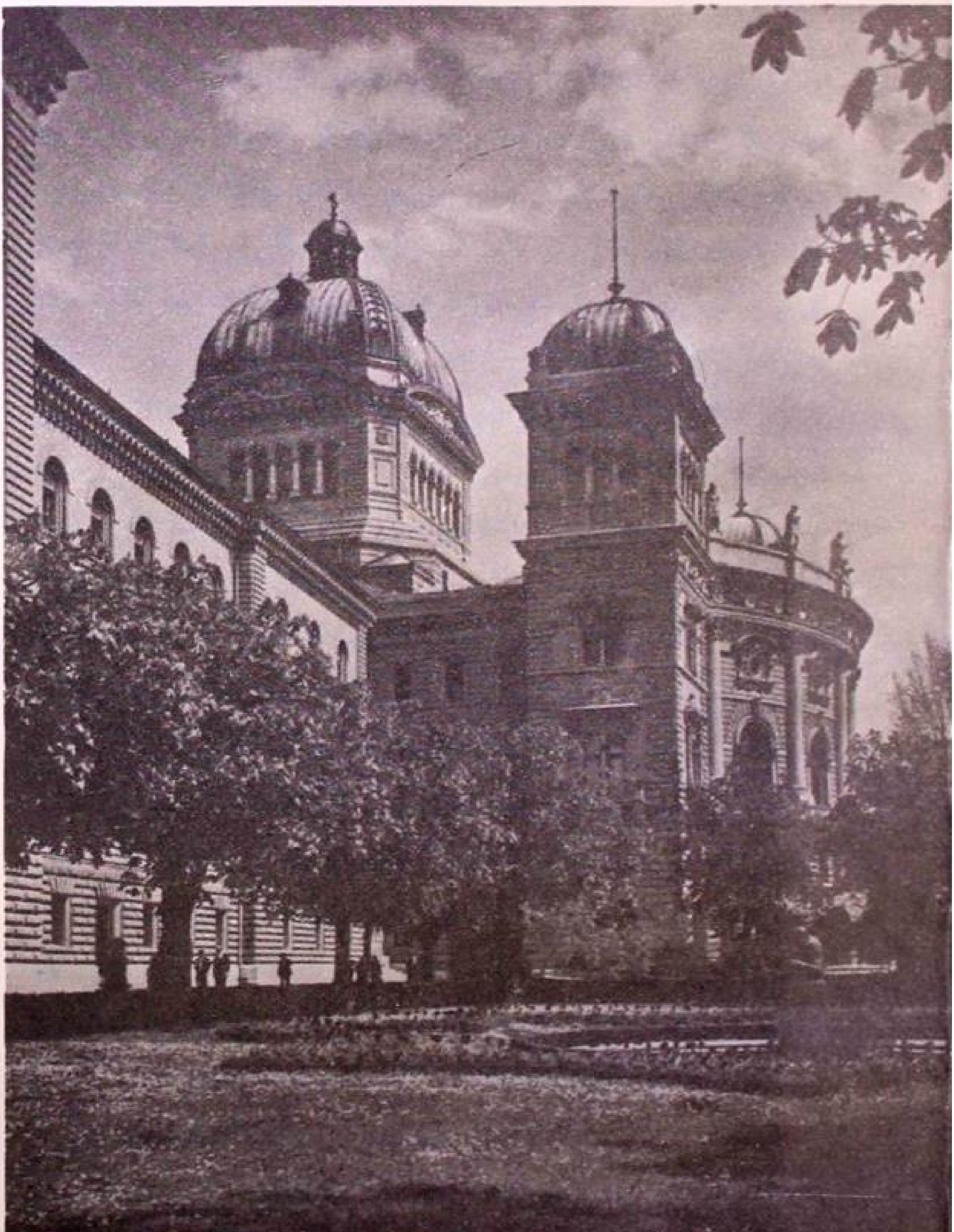
وہاں حکومت کا نظام عمل کیا ہوگا ۔

## نظام حکومت

جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں ، ان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس ملک پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن اس دشوار مسئلے کو آج سے بہت پہلے حل کرلیا گیا ہے ۔ دراصل اس ملک میں دنیا کے بہت سے دوسرے ملکوں سے بالکل مختلف انداز حکومت ہے ، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید اصولوں کی روشنی میں وہاں کوئی حکومت نہیں ہے ، اس لیے کہ اس کا نظم و نسق چند ارباب اقتدار نے سنبھال رکھا ہے ۔ مناسب ترین الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہاں مستقلاً ایک مخلوط قسم کا نظام حکومت قائم ہے جس میں بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندے اپنی اہمیت کے اعتبار سے حصہ لیتے ہیں ۔

وفاقی مجلس سات اراکین پر مشتمل ہوتی ہے جن کو کثرت رائے سے منتخب کیا جاتا ہے ۔ وہ اراکین ایک کابینہ کے فرائض انجام دیتے ہیں ، لیکن عمیق مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے ڈائرکٹروں کے بورڈ سے مشابہہ ہوتی ہے ۔ بظاہر وہ ایک جمہوریہ ہے ، کیونکہ حاکمیت منتخب نمائندوں کے سپرد ہوتی ہے ۔ بیس سال سے زیادہ عمر کا ہر سوئس باشندہ ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے ۔ رکنیت کے لیے سیاسی جماعتیں اپنے نمائندے نامزد کرتی ہیں ۔ آزاد امیدوار کوئی نہیں ہوتا ۔ مطلب یہ کہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستگی ضروری ہے ۔

کابینہ میں سات وزارتیں ہیں ۔ مثلاً (١) امور خارجہ ۔ (٢) امور داخلہ ۔ (٣) عدلیہ اور پولیس ۔ (٤) دفاع ۔ (٥) مالیات ۔ (٦) زراعت و صنعت اور (٧) حمل و نقل ، مواصلات اور توانائی ۔



برن میں پارلیمان کی عمارت جس میں قومی اور بین الاقوامی مسائل زیرِ بحث آتے ہیں۔

ان وزارتوں سے متعلق ساتوں اراکین باری باری ایک سال کے لیے صدر بنائے جاتے ھیں اور جو وزارت اس کی تحویل میں ھو، وہ بدستور برقرار رھتی ھے۔ عملی طور پر وہ اس بورڈ کا چیرمین ھوتا ھے۔ سال ختم ھونے پر نائب صدر اس کی جگہ لے لیتا ھے، جس کے لیے کسی باقاعدہ فیصلے کی ضرورت نہیں ھوتی۔ نیا نائب صدر مقرر ھو جاتا ھے۔

سوئزر لینڈ جیسے چھوٹے سے ملک میں یہ نظام عمل خوب چل سکتا ھے۔ کچھ بھی ھو، اس طرح سیاسی ھنگامے کبھی اپنا رنگ نہیں جماتے۔ انتخابی مہم اعلا سطح تک رھتی ھے۔ اگر کوئی جماعت جھگڑا کر بیٹھے تو اسے ترک کردیا جاتا ھے۔ ھر وزارت کے سربراہ کے لیے اپنے فرائض منصبی سے واقف ھونا ضروری ھوتا ھے۔ اس لیے وہ کسی خوف و فکر یا حمایت و ھمدردی کے بغیر کام کرتا رھتا ھے۔ یہاں حکومت کو کبھی شکست نہیں ھوتی اور یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ملک میں کوئی سیاسی بحران رونما ھوگا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ھے کہ مکمل اختیارات کے باوجود وفاقی مجلس کے کسی رکن کو آمرانہ اقتدار حاصل نہیں ھوتا۔ اس کے برعکس وہ پارلیمانی اور ریاستوں کی مجالس کا ادنا خادم سمجھا جاتا ھے۔ ملک کو آبادی کے اعتبار سے کئی علاقوں میں تقسیم کیا گیا ھے۔ ھر علاقہ ایک کینٹن کہلاتا ھے۔ ایسے ھر علاقے سے دو رکن منتخب ھوتے ھیں۔ اوسطاً چوبیس ہزار باشندے ایک رکن کا انتخاب کرتے ھیں۔

دستور العمل کے مطابق ھر وفاقی کونسل اپنی سفارشات دونوں ایوانوں کو بھیجتی ھے اور ان سے بھی منظور ھوجانے کے بعد اگر تیس ہزار باشندے کسی سفارش کے خلاف ووٹ دے دیں تو پھر سارے ملک میں اس موضوع پر استصواب رائے کرا کے آخری

فیصلہ کیا جاتا ہے - وفاقی دستور العمل مین کوئی ترمیم و تنسیخ یا نظر ثانی کرانی ہو تو پچاس ہزار باشندوں کو اس بارے میں تحریری بیان دینا پڑتا ہے -

بعض علاقے اتنے خود مختار ہیں کہ وہ سرکاری طور پر اپنے آپ کو جمہوریہ کہتے ہیں - حالانکہ عملی طور پر سارے ملک میں جمہوریت قائم ہے - خاص علاقوں کو خود مختاری کا حق وفاقی دستورالعمل ہی کے بموجب دیا گیا ہے - ملک بھر میں وفاقی علاقوں کی تعداد کچھ کم تین ہزار ہے - آئے دن استصواب رائے کے موقعے آتے رہتے ہیں - اس طرح ہر باشندے کو سال میں پانچ چھے بار رائے شماری میں حصہ لینا پڑتا ہے - سیاسی جماعتوں کے سربراہ ان موقعوں پر بڑے مستعد رہتے ہیں - وہ اپنے علاقے کے ان رائے دھندگان کے نام ایک سانس میں لے سکتے ہیں جن سے مطلب براری یقینی ہوتی ہے -

وفاق سوئزر لینڈ کو بہت ہی متوازن جمہوری نظام کہا جاسکتا ہے - جیسا کہ کہا گیا ہے ، یہ قوم نسلی ، لسانی ، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے بہت ہی مختلف النوع ہے ، لیکن اس کے باوجود خیرسگالی ، رواداری اور باہمی تعاون و رفاقت کے جذبات اتنے عام ہیں کہ سب کے سب ایک باغ کے مخلتف پھولوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں - گویا وہ سب ایک ایسے خاندان کے افراد معلوم ہوتے ہیں جو ایک ہی مکان کی چار دیواری میں آباد ہو ، اگرچہ انسانی فطرت کے مطابق کبھی کبھی ان میں جھڑپ بھی ہوجاتی ہے ، لیکن وہ عارضی ہوتی ہے - طبیعت کا معمولی سا اختلاف ان کی ابتدائی قومیت کی بنیاد پر ہے - مثال کے طور پر اطالوی سوئستانی اپنے ان ہم وطنوں کو کہ جو جرمن زبان بولتے ہیں ، زیادہ مستعد ، محنت کش اور خشک مزاج پاتے ہیں - اس کے

برعکس موخرالذکر فرانسیسی سوئستانیوں کو بہت زیادہ جذباتی اور حساس سمجھتے ہیں -

ایک بات سب میں مشترک ہے - ہر شخص انتہائی محنت کش ہونے کے علاوہ اپنے کام میں پوری طرح ہنر مند اور مشاق ہوتا ہے - اسی لیے اس ملک کی بنی ہوئی ہر چیز معیاری ہوتی ہے - دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یہاں کے باشندوں کی زندگی غیر معمولی طور پر زیادہ خوش حال ہوگئی ہے - یہاں تک کہ سارے یورپ میں ان کا معیار زندگی سب سے زیادہ اونچا ہے - بڑی بات یہ ہے کہ ملک کی دولت سب میں برابر تقسیم ہے - کوئی صنعت مرکزی نظام کے تحت نہیں ہے - اس لیے غیر معمولی طور پر بڑے شہروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور گندے گنجان آباد علاقے بھی کہیں نظر نہیں آتے - دراصل تعلیم کا عام اور اعلا معیار ہونا قومی افتخار کا سب سے بڑا سبب ہے -

صنعتی کارخانوں میں جن میں سے بیشتر چھوٹے پیمانے پر قائم ہیں اور جن میں گھریلو صنعتوں کے انداز میں چیزیں تیار ہوتی ہیں اور جن میں زیادہ تر ایک ہی کنبے کے افراد کام کرتے ہیں، ہڑتال کبھی نہیں ہوتی - اپنے مطالبات منوانے کی خاطر کوئی ہنگامہ تک سننے میں نہیں آتا - مالکوں اور مزدوروں کے تعلقات چھوٹے بڑے سب ہی کارخانوں میں ہمیشہ استوار اور خوش گوار رہتے ہیں، کیونکہ کام کرنے والوں کو معقول معاوضہ ملتا ہے اور ان کے مفادات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے، اسی لئے ہڑتال کا تصور بھی ان کے نزدیک بڑی زیادتی ہے -

## ضرورت سے زیادہ روزگار

دنیا کے بہت سے ملکوں میں بے روزگاری یا کم روزگاری کا چرچا ہے، لیکن سوئزر لینڈ میں "ضرورت سے زیادہ روزگار"، کا

سکہ چل رہا ہے اور وہاں یہ بات ضرب المثل بن گئی ہے کہ کسی صنعت یا تجارت یا عام کاروبار پر نظر ڈالی جائے تو ہر شخص بے حد مصروف نظر آئیگا ، کیونکہ کام اتنا زیادہ ہےکہ سب لوگ مل کر محنت شاقہ کے بعد اسے پورا کرسکتے ھیں - مقامی باشندوں کی مصروفیت کا تو ذکر ھی کیا ، پانچ لاکھ کے قریب غیر ملکی افراد کو یہاں روزگار ملا ہوا ہے - ان میں زیادہ تر اطالوی ، آسٹریائی ، ھسپانوی اور یونانی ھیں -

کل آبادی کا صرف ساڑھے بارہ فیصد حصہ زراعت سے تعلق رکھتا ہے - اس طرح قوم کی صرف ایک تہائی غذائی ضرورت اس سے پوری ھوتی ہے - باقی سامان خوراک درآمد کیا جاتا ہے - یہاں کے تیار شدہ پنیر کی ساری دنیا میں مانگ ہے - لہذا پنیر کے بدلے میں بہت سی چیزیں درآمد کرلی جاتی ھیں - پھر ملک کی معیشت میں سیاحت کے کاروبار کو بھی بڑا دخل حاصل ہے - حکومت نے سیاحوں کی سہولت اور ان کی اطلاعات کے لیے شعبے قائم کر رکھے ھیں -

## صنعت و حرفت

ھر چند کہ سوئزر لینڈ یورپی ممالک کی گود میں بیٹھا ہے مگر آتش جنگ اس کو چھوتی تک نہیں ہے - میں ھمیشہ ھی یہ سوچا کرتا ھوں کہ آخر سوئزر لینڈ کی پالیسی پر دوسرے ممالک کیوں کار بند نہیں - دو بڑی جنگوں نے ان کو بری طرح جھلس دیا ہے ، ان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے ، مگر یہ پھر بھی بن سنور کر تیسری جنگ کی آمد کے منتظر ھیں بلکہ اسے دعوت دے رہے ھیں - انسانی جان کس درجہ ارزاں ھوگئی ہے اور شرف انسانی کس قدر تار تار ھوا ہے -

سوئزر لینڈ میں کہیں نکل جائیے ، ملک میں بہت سے




سوئٹزرلینڈ کی گھڑی اور کاڑھنے کی مشین پہلی بار جاپان کی منڈی میں پہنچی ہے۔

کارخانوں کی چمنیاں نظر آتی ہیں جن میں سے ہر وقت دھواں نکلتا رہتا ہے، لیکن مسکراتے ہوئے بشاش چہروں پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دہات کی صنعتوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کارخانے چھوٹے چھوٹے ہیں، لیکن ہر کارخانہ صبر و استقلال، کمال فن اور صحت مندانہ کارکردگی کے ساتھ صرف وہ چیز بناتا ہے جس میں اس کی ہنر مندی انتہا کو پہنچی ہوتی ہے۔ مشینی اوزار، نازک آلات، بجلی کا سامان، ناپ تول کے پیمانے اور سب سے زیادہ ہر قسم کی گھڑیاں اور گھنٹے خصوصی شان رکھتے ہیں، دنیا کے کسی بھی حصے میں جاکر دیکھیے، سوئزر لینڈ میں بنے ہوئے وقت ناپنے کے پیمانے وہاں موجود ہونگے۔ چنانچہ ملک سے برآمد ہونے والے سامان میں ساڑھے بارہ فی صد حصہ صرف گھڑیوں کا ہوتا ہے۔ پچاس فی صد دوسری مشینیں ہیں۔

سائنسی تحصیلات میں بھی اس کی شہرت کچھ کم نہیں ہے۔ بازل کی کیمیائی صنعت گھڑیوں کی صنعت کے برابر ہی ہے۔ مشرقی حصۂ ملک نے پارچہ بافی کی صنعت میں نام پیدا کرلیا ہے۔ کڑھائی اور کٹاؤ کا کام بھی بہت ہوتا ہے۔

یہ کہنا تو شاید صحیح نہ ہو کہ سوئزر لینڈ اپنی ضرورت کی ہر چیز بنا لیتا ہے۔ وہ ضرورت کی اشیا درآمد بھی کرتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ملک جو چیزیں بناتا ہے اس میں صنعت و ہنر بلندیوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ وصف اس کے معاشی و اقتصادی نظام کو مربوط رکھتا ہے۔ شاید یہ بات بھی مبالغہ نہ ہو کہ سوئس لوگ دیانت و امانت میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا بھر کی زر و دولت یہاں کیسے کھنچی آتی! وہ صنعت و حرفت میں بھی دیانت دار ہیں، اپنے ملک سے بھی اور دوسرے ممالک سے بھی۔ میں سوچتا ہوں

کہ ایسی دیانت ہی پاکستان کو سر بلند کرسکتی ہے۔

## بنکاری

اس کے بعد سوئزر لینڈ میں بنکاری اور بیمے کے کاروبار کا ذکر خیر باقی رہ جاتا ہے ، کیونکہ ان کا تعلق بھی عالمگیر نوعیت کا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی چھوٹا یا بڑا ملک ایسا ہو جس کے افراد کا رپیہ اس ملک کے کسی نہ کسی بنک میں جمع نہ ہو یا اس ملک کی کسی انشورنس کمپنی نے اس کا بیمہ نہ کر رکھا ہو۔ بنکاری کا نظام خاص طور پر اتنا نرالا ہے کہ اس کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ اس لئے ہر قسم کا غیر ملکی زرمبادلہ بھی یہاں آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ دراصل اس نظام نے باقاعدہ ایک صنعت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

عام لوگوں کا ذاتی برتاؤ بھی کچھ کم جاذب توجہ نہیں ہوتا۔ سیاح تو ان کی طبیعت کے فطری رجحان ہی سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ وہ ہرشخص سے خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی ، بہت اچھی طرح ملتے ، خلوص و یگانگت کا اظہار کرتے اور بہت جلد اسے اپنا گرویدہ کرلیتے ہیں۔ مختصر سی ملاقات بھی ، خواہ وہ مصافحہ کرنے کی حد تک ہو ، اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ کسی بھی پہاڑی مقام پر ، جہاں چند دیہاتی ہی رہتے ہوں ، سیاح چلے جائیں ، ان کا خیر مقدم کرنے والی نگاہیں دل موہ لیتی ہیں۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اپنے قومی انداز میں سلام تو ضرور کر ہی لیتے ہیں۔ سیاح کا قیام کسی سیدھے سادے گاؤں میں ہو یا کسی شاندار ہوٹل میں ، وہاں کا مالک اپنے آپ کو میزبان ظاہر کرتے ہوئے ہر گاھک کو اپنا معزز مہمان سمجھتا اور ویسا ہی برتاؤ کرتا ہے۔ میں نے سوئزر لینڈ کو ایک بار نہیں بارہا

دیکھا ھے ۔ میں یہاں کے شہروں میں بھی گھوما پھرا ہوں ۔ سیاح کو یہاں کے بچے تک پہچان لیتے ھیں اور ان کا پرجوش استقبال کرتے ھیں ۔ پیارے بچے ہاتھ ھلا ھلا کر سیاحوں کا خیر مقدم کرتے ھیں اور ان کی دوڑتی ھوئی موٹروں کو مسرت و شادمانی کے ساتھ دیکھتے ھیں ۔ میں ان فرشتوں کی معصوم اداؤں سے ھمیشه متاثر ھوا ھوں اور والدین کی اعلا تربیت کا مداح رھا ھوں ۔

ان تمام خصوصیات اور فطری رجحانات کو بیان کرنے کا مقصد یه ظاهر کرنا ھے که اس ملک کا نظام حکومت کس نوعیت کا ھے ، کیونکه ھر شعبه زندگی میں سرکاری عمل و دخل کار فرما رھتا ھے ۔ سالها سال کے بنائے ھوئے اصولوں پر عمل ھوتا چلا آیا ھے جن سے یہاں کے لوگوں کی فطرت ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی ھے اور اطوار و آداب نے ایک منفرد رخ اختیار کرلیا ھے ۔ وفاقی حکومت ھو یا ضلعی ، اس کے ارباب اقتدار عوام سے اس طرح برتاؤ کرتے ھیں ، گویا که وہ ان کے ایک بڑے کنبے کے افراد ھیں ۔

کہنے کا مطلب یه ھے که پروھیلویتیا کا حسن انتظام ملک کے نظام حکومت کی طرح تمام سیاحوں کے لیے اطمینان بخش تھا اور مجھے خوشی تھی که اس ادارے نے ھمارے قیام کا اهتمام هوٹل لاریزی ڈنس میں کیا جس میں ایک بار پہلے بھی رہ کر میں نے سکون و اطمینان حاصل کیا تھا ۔ اس دفعه چونکه بچیاں بھی میرے ساتھ تھیں ، اس لیے وھاں سکونت زیادہ مناسب و موزوں تھی ۔ ریلوے اسٹیشن سے دو ٹیکسیوں میں ھمارا قافله ھوٹل پہنچ گیا ۔ دونوں ٹیکسیوں کے کرائے کے طور پر کوئی ایک سو رپے خرچ ھوگئے ، جس کا بار یقیناً محسوس ھوا ۔ ھوٹل کے اخراجات

یہاں بھی زیادہ ہیں ۔ جاپان کو خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے ، سوئزر لینڈ جاپان سے کم گراں نہیں ہے ۔ ٹوکیو میں ہوٹل کا کرایہ اگر ایک سو تھا تو جنیوا میں اسی معیار کا ہوٹل آج تین سو رپے وصول کرتا ہے ۔ یہ نرخ سرمائی ہیں ۔ موسم گرما میں نرخ میں اضافہ ہوجاتا ہے ، کیونکہ اس وقت سیاحوں کی وجہ سے مانگ بڑھ جاتی ہے اور گنجائش کم ہوتی ہے ۔

دوپہر کو ایک چھوٹے سے ریستوران میں جا کر ذرا ظہرانہ کھایا تو سوا سو رپے دینے پڑگئے ۔ پاکستان میں اسی قسم کا کھانا زیادہ سے زیادہ پچیس رپے میں مل جاتا ۔

## بود میریانا لائبریری

زیورخ سے مسز ہان و تھیرچ نے ٹیلے فون پر بتایا کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق بود میریانا لائبریری کو ضرور دیکھ لیا جائے جس کا اہتمام ڈاکٹر برون نے کیا ہے ۔ یہ بڑی اہمیت کی چیز ہے ۔ اسے دیکھنا ضروری ہے ۔ انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ اگر ان کا تیار کردہ پروگرام کسی وجہ سے پسند نہ ہو تو متعلقہ جگہوں کو مطلع کردیا جائے ، تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو ۔ نیز کسی تبدیلی کے لیے اور نئے پروگرام کے لیے ہماری امداد درکار ہو تو ہم ہر وقت ہر خدمت کے لیے تیار ہیں ۔ میں نے مسز ہان وتھیرچ کا شکریہ ادا کردیا ۔

ہم ٹھیک وقت پر ہوٹل سے روانہ ہوئے ، لیکن ٹیکسی ڈرائیور کی لاعلمی کی وجہ سے بود میریانا لائبریری میں پانچ منٹ تاخیر سے پہنچ سکے ۔ اس نے میرے مزاج کو برہم کر دیا ۔ برہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے دوپہر کے کھانے میں ذرا دیر کردی تھی ، جس پر میں شروع ہی سے ناخوش تھا ۔

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ خود ڈاکٹر برون صاحب وہاں

موجود نہیں تھے - وہ سوا دو بجے آئے اور معذرت خواہ ہوئے - پتہ یہ چلا کہ ان کے آنے کا وقت ہی سوا دو بجے ہے - خیر ، میری کوفت جلد ہی دور ہوگئی - ڈاکٹر برون صاحب بہت ہی اچھے انسان ثابت ہوئے - وہ ڈیڑھ گھنٹے تک ہم کو لائبریری دکھاتے اور اس کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہے - میں حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انہیں داد دیتا رہا - مجھے زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ ایک شخص نے ذاتی سعی وکاوش سے اتنی بڑی لائبریری کیسے بنائی جس میں ہر عالم کی اصل تحریروں کو جمع کردیا گیا ہے - نیز ہر کتاب کا قدیم ترین ایڈیشن بھی یہاں موجود ہے -

میں نے اس لائبریری سے ایک بہت ہی اہم تاثر لیا - میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے بھی اپنے ملک کے بلکہ سارے برصغیر پاک و ہند کے اہم مصنفین سے رابطہ قائم کرنا چاہیے - اور ان کی تصانیف کے اصل مسودات حاصل کرلینے چاہئیں - اندازہ یہ ہے کہ اگر بھرپور جد و جہد کی گئی تو سینکڑوں مسودے مل سکیں گے اور محفوظ ہوجائیں گے -

اس مقصد کے لیے تمام فوت شدہ اور بقید حیات مصنفین کی ایک فہرست بنانی ہوگی - جو اس وقت زندہ نہیں ، ان کے عزیز و اقارب یا لواحقین کا پتہ چلا کر ان سے رابطہ قائم کرنا ہوگا - نیز ان کے ناشرین سے بھی بات چیت یا خط و کتاب کرنی ہوگی ، کیونکہ کتابوں کی اشاعت کے بعد ناشرین کے پاس اصل مسودات پڑے رہ جاتے ہیں - ان مسودات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوسکیگا کہ ہر مصنف کا انداز تحریر کیا تھا - وہ اپنی ہی تحریر میں ایک بار لکھ دینے کے بعد کس طرح کتر بیونت یا ردو بدل کرتے تھے - پھر یہ کہ اصل تحریر اور طبع شدہ کتاب کی عبارت

میں کوئی فرق ہے ، کوئی کمی بیش یا تحریف ہوئی ہے تو اس کا بھی علم ہوجائے - سبھی ناشرین اچھے پڑھے لکھے یا صاحب ذوق نہیں ہوتے - کبھی کبھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر چھپی ہوئی کتاب اصل مسودے کے مطابق نہیں ہوتی - کوئی بڑا نقص رہ جائے تو غریب مصنف کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے - مسودات پر تحقیقات کرنے والے بتا سکینگے کہ لغزش خود اسی سے ہوئی ہے یا ناشر صاحب نے اس پر کرم کیا ہے -

ظاہر ہے کہ یہ کام نہایت اہم ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ مشکل بھی ہے - تاہم اگر ابتدائی کام کرلیا جائے تو آئندہ برصغیر میں ایک مرکز مطالعہ قائم ہوسکتا ہے - اس مرکز مطالعہ و تحقیقات کے لیے جملہ مسودات کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں - تاہم یہ مطلوبہ صورت اسی وقت پیدا ہوگی کہ جب حکومتیں اپنے اہل فکر و نظر اور ارباب علم و ادب کو صحیح مقام عزت عطا کریں - ان کی قدر دانی اور ہمت افزائی ہو - افسوس کا مقام ہے کہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے ، اس انداز کا کوئی کام نہیں ہوسکا ہے - ظاہر ہے کہ جب تک اہل قلم کو مقام عز و شرف نہیں دیا جائیگا ان کی نگارشات کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوسکے گی جس کی وہ مستحق ہیں -

یہ بات ماننی پڑیگی کہ اہل قلم کو مقام عز و شرف دینے کے ساتھ ساتھ تحصیل علم و تعلیم کو بھی لازمی طور پر اہمیت دینی ہوگی - اور اس مقصد کے لیے وسائل و ذرائع پیدا کرنے ہوں گے - تاہم اس مقصد کے لیے موجودہ ارباب حکومت یا اصحاب حل و عقد سے کوئی توقع نہیں ہوسکتی - وہ معاشرے کو سدھارنے اور بلند مقام پر لے جانے کے بجائے اپنی سیاسی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہتے ہیں - مقصد برآری کے لیے ان کا دائرۂ عمل بڑا

محدود ہے۔ مگر مایوس ہوکر بیٹھ جانے کے بجائے ایک فکری انقلاب لانے کی کوشش لازمی ہے۔ پاکستان میں ارباب علم و ادب اور اہل فکر و نظر کی عزت و تعظیم کی راہوں کو ہموار کرنے کے لیے ایسے انقلاب کی ضرورت ہے۔ میں نے ڈاکٹر برون کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے نہ صرف میری معلومات میں اضافہ کیا بلکہ میرے لیے ایک نیا لائحہ عمل بھی پیش کردیا۔

## عالمی ادارۂ صحت

بود میریانا لائبریری سے فارغ ہوکر میں بعجلت ٹیکسی میں عالمی ادارۂ صحت کے مرکزی دفتر پہنچا۔ وہاں مجھے چار بجے مسٹر کارلوس فیدالے سے ملاقات کرنی تھی جو اس کے افسر رابطہ ہیں۔ غنیمت ہے کہ وہاں پہنچنے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ وہ نئے آدمی ہیں۔ ان کو مجھ سے تعارف حاصل نہیں تھا۔ میں نے ان کو سب کچھ بتا دیا۔ چند منٹ بعد وہ مجھ سے بے تکلف ہوگئے۔

میں نے ان سے طب مشرقی کے بارے میں دریافت کیا کہ اب عالمی ادارۂ صحت کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ چند ہی روز پہلے ادارے کی مجلس عاملہ کے ایک اجلاس میں اس مسئلے پر غور و فکر ہوا تھا اور ڈاکٹر تابا اس ضمن میں اہم ہدایات دے گئے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں اسکندریہ میں ڈاکٹر موصوف سے ملاقات کے لیے جارہا ہوں۔ انہوں نے اس موضوع پر مجھے لکھا تھا اور میں نے اپنا نقطۂ نظر ان پر واضح کردیا تھا۔ یہ سن کر مسٹر کارلوس کا انداز گفتگو بدل گیا۔ انہوں نے احترام کی حدوں کو چھولیا اور آخر میں میری درخواست پر خانم ڈی سلوا اور بچیوں کے لیے عالمی ادارے کی سیر کا اہتمام کردیا۔

## ڈاکٹر عبدالسلام

میں نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو اطلاع کردی کہ میں عالمی ادارۂ صحت کے مرکزی دفتر میں موجود ہوں - میں نے ڈاکٹر عنایت خاں صاحب کو بھی مطلع کرادیا اور بچیوں سے کہہ دیا کہ عنایت خاں ایئر پورٹ چلے جائیں گے ! چنانچہ جب ڈاکٹر عبدالسلام صاحب آئے تو ڈاکٹر عنایت صاحب کا پیغام لے کر آئے کہ وہ ہوائی میدان گئے ہیں ! ڈاکٹر عنایت خاں صاحب سے پاکستان کے اہل سائنس نے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں - مگر ان کو عالمی ادارۂ صحت کی آب و ہوا زیادہ راس آئی ہے - مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ تو اب یہاں اپنا مکان بھی بنا چکے ہیں -

میری ان سے خاصی پرانی یاد اللہ ہے - ان کی خدمت کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا ہے - مگر جنیوا میں جب بھی میں آتا ہوں وہ عجیب اتفاق ہے کہ ہوائی میدان پر ہوتے ہیں !

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے صرف خط و کتابت ہی ہوئی تھی اور آج پہلی بار اپنے وطن سے بہت دور ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا - وہ سراپا محبت و خلوص ہیں - حتیٰ کہ وہ اپنی موٹر میں ہم کو ہوٹل تک چھوڑنے آئے اور اس طرح جنیوا کی ایک اور سیر انہوں نے کرادی - سوچنے کی بات ہے کہ انسانوں میں کتنا فرق ہوا کرتا ہے -

## افضل محمود صاحب

اقوام متحدہ کے یورپی دفتر واقع جنیوا میں پاکستان کا بھی ایک مستقل مشن قائم ہے - اس میں افضل محمود صاحب نائب کے عہدے پر مامور ہیں - انہوں نے میرے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کردیا - وہ حکیم مفتی صادق انیس کے ہم زلف

ھیں - ان کے بعد ھی جناب جی الانا صاحب سے بھی ملاقات ھوئی - پاکستان کو یہ اعزاز حاصل ھوا ھے کہ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی والے کمیشن کے وہ اس سال چیرمین منتخب ھوئے ھیں - خود ان کی ذات کے لیے بھی یہ ایک عالمی اعزاز ھے جس کا ان کو بہ خوبی احساس ھے -

پاکستان کے مستقل سفارت خانے میں جناب محمد یونس صاحب سفیر کے عہدے پر فائز ھیں - یونس صاحب اور ان کی شریک حیات بھی اس کھانے پر مدعو تھے - سفیر نائجیریا اور سفیر ترکی وغیرہ کو بھی مع بیگمات دعوت دی گئی تھی - افضل محمود صاحب اور ان کی نصف بہتر نے بہت پر تکلف دعوت دی - میں نے ان کا دلی شکریہ ادا کیا جو محض رسمی نہیں بلکہ دلی جذبات سے تعلق رکھتا تھا -

رات گیارہ بجے یہ مجلس برخاست ھوئی -

آج کے کھانے پر سوئزر لینڈ کا بنا ھوا ایک مشروب یعنی آب انگور پیا جسے " گریپولا " کہتے ھیں - آب انگور کو کاربو نائزڈ کرلیا گیا تھا - بہت ھی لذیذ اور مفرح مشروب تھا - میں نے کمپنی کا پتہ نوٹ کرلیا - میں نے غور کیا کہ پاکستان کے لیے ایسے ھی مشروب کی ضرورت ھے - شاید خط و کتابت کے بعد اس کمپنی سے رابطہ قائم ھو جائے - ھمدرد لیبارٹریز میں یہ چیز آسانی سے تیار ھوسکتی ھے - پاکستان ، خاص طور سے شہر کراچی میں موسم گرما کی مدت خاصی طویل ھوتی ھے - لوگ کام و دھن کی لذت حاصل کرنے میں تنوع چاھتے ھیں - یہ نئی چیز ضرور پسند کی جائیگی -

بارہ بجے کے بعد بستر پر دراز ھوگیا اور دن بھر کے واقعات پر غور کرتا ھوا کچھ دیر بعد سو گیا -

# جنیوا میں جمعۃ المبارک

معمول کے مطابق صبح کو آنکھ وقت پر کھل جاتی ہے اور اس کے بعد ہرگز نیند نہیں آتی - میں خاموش بستر پر لیٹا رہا اور میرا دماغ جنیوا سے شیراز تک مختلف خیالات میں گم رہا - معاً لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر میری زبان پر آگیا :

صباح الخیر زد بلبل کجائی ساقیا بر خیز
کہ غوغہ می کند درسر خمار خمر دو شینم

میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ شعر حافظے کی لوح پر کیوں ابھرا - بلبل شیراز کا تو ذکر ہی کیا کسی معمولی بلبل کا وجود بھی دور دور تک ممکن نہیں تھا - پھر وہ ساقی ناپید تھا جسے اٹھنے کے لیے کہا گیا تھا - میں نے نہ گزشتہ رات نہ اس سے پہلے کبھی شراب پی تھی، کیونکہ مے نوشی سرے سے اپنے مسلک کے خلاف ہے - لہذا کیفیت سکر سے سر میں غوغہ ہونا بھی بے معنی تھا - شاید اس شعر کی شان نزول مصرع اولیٰ کا پہلا لفظ تھا - صبح ہوئی - ہر طرف گڈ مارننگ کی صدا بلند ہوئی تو اسی رعایت سے مجھے پورا شعر یاد آگیا - حافظے کے کرشمے کبھی کبھی یہ رنگ دکھاتے ہیں -

میں بیدار تو ہوگیا ، مگر دونوں بچیوں اور خانم ڈی سلوا کے خیال سے بستر پر پڑا رہا - ان کو اتنے سویرے جگانا مناسب نہیں تھا - یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ میں ایک علاحدہ کمرہ لیتا - اس کا کرایہ بہت زیادہ ادا کرنا پڑتا - حالانکہ میرے وقت

کی قدر و قیمت اس کرائے کی رقم سے کہیں زیادہ ہے ۔ مگر اس وقت حالت سفر تھی اور پاکستان کے ارباب اقتدار نے جو زرمبادلہ عطا کیا وہ اس قدر ناکافی تھا کہ مجھے قرض لینا پڑا اور ابھی کچھ اور انتظام کرنا ضروری تھا ۔ بچیوں نے کہا کہ آپ نے جامعہ برن کے عطیے کو کیوں واپس کردیا ۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ اصول کی خاطر انسان کو ہر چیز قربان کردینی چاہئے ، خواہ اس کے بعد پریشانیوں کا سامنا ھی کیوں نہ کرنا پڑے ۔ ضمیر کی تشکیل اور ذہن کی تعمیر صرف اسی طرح ممکن ہے ۔ کردار کی بنیاد ضمیر کی پختگی کے ساتھ رکھی جاتی ہے ، تب ھی قوم کی عمارت مستحکم رہتی ہے ۔

پروگرام کے مطابق عالمی ادارۂ عمال (ILO) کے صدر مقام پر جانا تھا ۔ اس ادارے کی تشکیل و تنظیم کا ایک سرسری خاکہ تو میں آگے بیان کروں گا ۔ آج اس ادارے کے اعلا افسران سے مل کر بعض معلومات حاصل کرنا مقصود تھا ۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر یعنی ساڑھے نو بجے وہاں پہنچ گیا ۔ صدر مقام کے دروازے ھی پر جناب شیڈرک ھینس میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے ۔ میں جب گاڑی سے اتر کر ان تک پہنچا اور ھاتھ ملایا تو ایک منٹ کی تاخیر ھوگئی تھی ، جس کی میں نے معذرت چاھی ۔ انہوں نے ھنس کر بات ٹال دی ۔

ھینس صاحب اپنے کام میں بہت ھی مستعد اور خوش اخلاق انسان تھے ۔ ان کی گفتگو سے میں نے خود میں زیادہ چستی اور انشراح محسوس کیا ۔ ان کے مزاج میں جو مقناطیسی قوت ہے اس نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا ۔ طے شدہ پروگرام میں ذرا سی تبدیلی یہ ھوئی کہ جو کام بعد میں کرنا تھا ، وہ پہلے ھوگیا ۔ اور پہلے کا پروگرام بعد میں ھوا ۔ میرے لیے اس فرق سے کوئی

جھول نہیں پڑتا تھا ۔ تقدیم و تاخیر ہوتی ہی رہتی ہے ۔ بس اتنی بات ہے کہ بنائے ہوئے پروگرام کا ہر پہلو عمل میں آجائے ۔

لہذا سب سے پہلے جناب محترم اے شہید صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ ان سے ملاقات کا موقع کبھی نہیں ملا تھا ۔ شہید صاحب اٹھارہ سال سے ادارۂ عمال سے وابستہ ہیں اور ادارے کے اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں ۔ یہاں ان کا وجود پاکستان کے لیے باعث افتخار کہا جاسکتا ہے ، لیکن پاکستان کی اندرونی اور بیرونی سیاست نے جب اس میں ضعف پیدا کردیا تو موصوف کی ترقی کی راہیں بھی محدود ہوگئیں ۔ نوبت بہ اینجارسید کہ اب پاکستان اس ادارے کی کسی بھی کمیٹی کا رکن نہیں ہے ، اور سکریٹریٹ کے عملے میں بھی اہمیت والے افراد کی کمی ہوگئی ہے ۔

جناب شہید صاحب سے تقریباً ایک گھنٹے تک تبادل خیال کیا اور عالمی ادارۂ عمال کے بارے میں ، اس کے انداز فکر اور طریق کار پر گفتگو ہوتی رہی ۔ میں نے سب پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کی ۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ میں نے ایک کتاب ” مزدور اور سرمایہ دار — اسلامی نقطۂ نظر سے “ مرتب کرکے شائع کی تھی ۔ عالمی ادارۂ عمال کی لائبریری کے لیے یہ کتاب ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے منگوائی گئی تھی ۔ اگر پاکستان اور اسلامی ممالک اس انداز سے غور کرتے تو قرآن و سنت کی روشنی میں بہت سے عالمی مسائل کا ، جو مزدور اور سرمایہ دار سے تعلق رکھتے ہیں ، جائزہ لیا جاسکتا تھا اور وحدت فکر کے ساتھ ان کا مناسب حل نکالا جاسکتا تھا جو اسلامی ہوتا ۔ مگر پاکستان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اس ادارے میں اللہ کا نام لینے کی جرات نہیں کرتا ۔ کسی اسلامی ملک مثلاً سعودی عرب

میں کوئی ایسا قانون اهمیت کے ساتھ رائج نہیں ہے ۔ میں اس پہلو پر اچھی طرح غور کرتا رہا کہ اگر ان عالمی اداروں میں اسلامی ممالک اللہ کا نام نہیں لینگے تو پھر تبلیغ کا فرض وہ کیسے پورا کرینگے ۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ان کی بے بسی بلکہ واضح الفاظ میں کتاب و سنت سے ان کی لاپروائی اس تبلیغ میں مانع ہے ۔

## ایک پینٹنگ

غور کرتے کرتے میں اس منزل پر پہنچا کہ قرآن و سنت پر مبنی مسئلۂ مزدور و سرمایہ دار پر ایک پینٹنگ تیار کراکے عالمی ادارۂ عمال کو بھیجی جائے تا کہ وہ اپنے ایوان اجلاس میں یا کسی مناسب جگہ پر آویزاں کردے ۔ آخر اقوام متحدہ کے صدر مقام پر اس کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل کے ہال میں ، کمرۂ انتظار میں اور غلام گردش وغیرہ میں مختلف ملکوں کے فنکاروں کی تصاویر آویزاں ہیں یا انہوں نے وہیں رہ کر دیواروں پر نقاشی کردی ہے ۔ ان تصاویر میں نصرانیت کی جھلک نظر آتی ہے بلکہ بت پرستی کے عہد کا نقشہ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے ۔ لوہے کا بنا ہوا زیوس دیوتا کا بت اسمبلی بلڈنگ میں رکھا گیا ہے ۔ پاکستان کے مایۂ ناز مصور عبدالرحمان چغتائی نے دو تصاویر بھیجیں جو مغل آرٹ کا نمونہ ہیں ۔ ان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی کوئی جھلک نہیں ہے ۔ اقوام متحدہ کے منصرم حضرات نے ان تصاویر کو بادل ناخواستہ قبول کیا اور عمارت کے کیفے ٹیریا میں بلند دیواروں پر انہیں آویزاں کردیا جن پر وہاں آنے والوں کی نظر مشکل سے پڑتی ہے ۔ پاکستان سے کوئی مناسب انداز کی چیز جاتی تو شاید اس کی قدر و منزلت ہوتی اور مناسب جگہ ملتی ۔

میرے منصوبے کے مطابق پینٹنگ پر پندرہ بیس ہزار روپے ضرور خرچ ہونگے ، لیکن ایک عظیم مقصد کے لیے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں ھے ۔ لہذا یہ کام کر ڈالنا چاہیئے ۔ اس مقصد کے لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی حکومت سے رابطہ قائم کرونگا کہ وہ سرکاری طور پر عالمی ادارۂ عمال کو مطلع کرے کہ مسئلہ مزدور و سرمایہ دار کے موضوع پر ایک پینٹنگ تیار ہورہی ھے جسے ادارے کے صدر دفتر میں کسی مناسب جگہ آویزاں کرنا مقصود ھے ۔ اس ضمن میں پاکستانی عوام کی رائے بھی لے لی جائیگی ۔ مجھے یقین ھے کہ میری تجویز کو سراھا جائیگا اور اسے قبول عام حاصل ہوگا ۔

اس ضمن میں یہ فیصلہ کرنا پڑیگا کہ ایسی پینٹنگ تیار کرنے کے لیے کسی مقامی مصور کی خدمات حاصل کرنی پڑینگی یا کسی پاکستانی فنکار کی ۔ سوئزرلینڈ میں بہت عمدہ آرٹسٹ گزرے ھیں اور اب بھی اپنی تخلیقات سے لوگوں کا دل موہ رھے ھیں ۔

سوئزرلینڈ کے فنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ضروری ھے کہ اس دور کی عام ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس ملک کی جغرافیائی کیفیت کو بھی ملحوظ رکھا جائے ، کیونکہ یہ یورپ کے بالکل وسط میں واقع ھے اور اس کے ارد گرد تین مختلف تہذیبیں پائی جاتی ھیں جن میں رائج الوقت مذھب بھی مختلف النوع ھیں ۔ میری مجوزہ پینٹنگ کا تعلق براہ راست دین اسلام سے ہوگا ۔ اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ھے ۔ پھر بھی اس کے نام لیوا پائے جاتے ھیں ۔ ممکن ھے کہ تلاش کرنے پر کوئی مسلمان آرٹسٹ ڈھنگ کا نکل آئے ۔

سوئزرلینڈ کا فنکار دو قدروں کے درمیان ڈانوا ڈول رہتا ھے ۔ کبھی تو وہ اپنے قومی احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے

قومی تشخص کو اجاگر کرتا ہے اور ایک محدود حلقے کے اندر رہ کر قدرتی طور پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیتا ہے اور کبھی وہ دنیا کے بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں رونما ہونے والی فنی کیفیات کا مطالعہ کرتا اور اپنے جذبات کو ان سانچوں میں ڈھال دینا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی دو عالمگیر جنگوں نے، جن کی بدولت کئی ملکوں میں شہنشاہیت کو زوال نصیب ہوا، اقتصادی اور ثقافتی قدروں پر گہرا اثر ڈالا، لیکن سوئزر لینڈ نے یہ اثر بالواسطہ لیا یعنی وہ زیادہ تر تماشائی بنا معاشرے کے نشیب و فراز کو دیکھتا رہا، لیکن ایک فنکار عام انسانوں سے الگ ہوتا ہے۔ اس کی دنیا مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے نئی روش اختیار کرلی۔

انسویں صدی عیسوی میں سوئزر لینڈ کی متحدہ ریاستیں اپنے ابتدائی دور میں تھیں۔ اس وقت زیادہ تر تین موضوعات فنکار کی توجہ کا مرکز بنتے تھے — بیرونی مناظر، عوام الناس اور تاریخ کے اوراق — بیرونی مناظر آج بھی اپنے دیرینہ اوصاف کے ساتھ فنکار کے لیے پرکشش ہیں۔ اس صدی کے شروع ہونے سے ذرا پہلے تک عموماً سوئزر لینڈ کے قومی جذبات کا اظہار مصور ایسے باشندوں کے روپ میں کرتے تھے جس سے ان کے محنتی، کفایت شعار اور سادگی پسند ہونے کا ثبوت ملے۔ انہیں دیہاتی اور قصباتی ماحول میں دکھایا جاتا تھا یا پھر ملک کی بہادری کے کارناموں سے بھرپور تاریخ اور آزادی کی کشمکش کی عکاسی کی جاتی تھی۔ بعض فنی نمونے عامیانہ انداز کے بھی ہوتے تھے۔ بعض میں طنزیہ اشارات مضمر ہوتے تھے۔

ان سب کے برعکس حقیقی معنوں میں جسے سوئزر لینڈ کے مثالی نمونے کہا جاسکتا ہے، وہ پہلی بار فرڈیننڈ ہاڈلر کی

تصاویر میں جھلک دکھاتے ہیں - پھر بھی اس نے قدیم مصوروں کی تخلیقات کے ساتھ ایک ربط قائم رکھا - اس نے بعد کے مصوروں میں ایک جان دار اسنگ اور فن سے پوری لگن پیدا کی - حالانکہ ھاڈلر ساری عمر اس کشمکش میں مبتلا رہا کہ وہ اپنا افق نظر برابر وسیع تر کرتا رہے - چنانچہ وہ قومی مصوری کا ایسا نمائندہ بن گیا جس کو بین الاقوامی سطح پر قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے - اس کے ہم عصروں میں فیلکس ویلوٹون ، تھیو فائل الیکسانڈر سٹین لین اور ھرمن اوب رسٹ قابل ذکر ہیں - لیکن اول الذکر دو فنکار سوئزر لینڈ میں اپنے میدان فن کو تنگ سمجھ کر فرانس چلے گئے اور ہمیشہ کے لیے وہیں کے ہورہے - آخرالذکر نے ایسے آرائشی نمونے پیش کئے جو آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں - ھاڈلر کے مد مقابل ہونے کی بہترین مثال کیونرایمیٹ کی کارآمد تخلیقات سے دی جاسکتی ہے - جو فنکار ھاڈلر کے فن سے سب سے زیادہ متاثر ہوکر اس کے رنگ میں ڈوب گیا وہ گوگن تھا - اس نے رنگوں کا بہترین امتزاج پیش کیا - اسے بروک کا رکن بن جانے کی دعوت دی گئی - یہ مخصوص طرز کے مصوروں کی ایک شہرۂ آفاق انجمن تھی -

اس کے بعد سوئزر لینڈ کے فنکاروں نے قرب و جوار کے ملکوں کے مصوروں سے اثرات قبول کرنے شروع کیے - اس مکتب فکر کا پہلا علم بردار گیا کومیٹی تھا - اس نے بیرونی غلبے کے ساتھ ساتھ قومی تشخص کو نظر انداز نہیں کیا - اس نے ایسی تصویریں بنائیں جو جیتی جاگتی معلوم ہوتی تھیں - البتہ لباس ، انداز نشست و برخاست اور پس منظر کا ماحول غمازی کرتا تھا کہ یہ سوئزر لینڈ کے کسی فنکار کی تخلیقات ہیں - اسی عہد میں دو مصور یعنی الیکسانڈر بلانچٹ اور مورس براڈ ایسے بھی گذرے جو مغرب کے

فنی ارتقا کے سامنے بالکل سرنگوں ہوگئے ۔ انہوں نے قومی خد و خال کو بالکل فراموش کردیا ۔

جو مصور عالمگیر لڑائی سے زیادہ متاثر ہوئے ، ان کی تخلیقات میں حزن و ملال کا رنگ جھلک دکھاتا ھے ۔ ان کے خاکوں اور تصویروں میں تمام شکلیں انتہائی غمگین نظر آتی ھیں ۔ حتیٰ کہ درخت ، پودے ، بیلیں ، پھول اور سبزہ بھی پالا مارا ھوا دکھائی دیتا ھے ۔ لڑائی کے بعد والے ابتدائی دور میں یہ کیفیات سب پر طاری ھوگئی تھیں ۔ ھر شخص کو ایک معاشرتی گھٹن اور تنہائی کا احساس ھوگیا تھا جو ادب اور فن میں نمایاں ھوگیا ۔

اس صدی کے شروع میں رینے اوبر گونوئس کے خاکوں اور تصویروں مین حیوانیت و درندگی بلکہ شیطنت امنڈتی نظر آتی ھے ۔ وہ بیھودہ انداز میں اپنے ماحول کی خرابیوں پر کڑی تنقید کرتا ھے ۔ اسی طرح میکس گبلر کا جوشیلا مزاج انسان کے چاروں طرف کی چیزوں کو جھلس کر اور گلا کر بے ڈھنگے ڈھانچوں ، پھانسی کے تختوں اور بھوتوں کی شکل میں تبدیل کردیتا ھے ۔ ثقہ لوگوں نے ان دونوں کی تخلیقات کو بالکل پسند نہیں کیا بلکہ نظر انداز کرتے ھوئے راندۂ درگاہ کر دیا ۔ نتیجہ یہ کہ موخرالذکر نے بد دل ھوکر مصوری کو خیر باد کہ دیا اور دماغی امراض میں مبتلا ھوجانے سے خود کشی کے لیے مجبور ھوگیا ۔

۱۹۳۸ء کے بعد والے زمانے میں سوئی لیٹ نے بیرونی مناظر کی عکاسی فرحت بخش انداز میں کی ۔ یہ کیفیت اس نے آبی رنگوں سے اور تجریدی رجحانات سے پیدا کی ۔ ایلس بیلی اور اوٹو موراخ نے اپنے فن کے لیے مہندسانہ نقاشی اور مستقبلیت کا انداز اختیار کیا جو کسی حد تک پسند کیا گیا ۔

ایک بار پھر دوسری جنگ عظیم کے اثرات ظہور پذیر ہوئے ۔ تصاویر میں مادیت پرستی ، افسر شاہی اور فوجی رجحان نے جھلک دکھانی شروع کی جسے حالات کا فطری نتیجہ کہا جاسکتا ھے ۔ ایسے فنکاروں کی تخلیقات کی جب نمائش ہوئی تو عوام نے انہیں بہت پسند کیا ۔ وہ خود بھی چوٹ کھائے ہوئے تھے ، اس لیے زخمی جگر کے درد کو گھائل نے پہچان لیا ۔ لیکن چونکہ انسانی فطرت ہمیشہ کے لیے یاسیت پسند نہیں ھوتی اس لیے یہ رجحان زیادہ عرصے نہ چلے اور جلدی ھی دم توڑ گئے ۔ اور جب امن و امان کی صورت پیدا ھوئی تو کئی مصور جو سوئزر لینڈ چھوڑ کر محض گھبراھٹ کی وجہ سے دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے ، واپس آگئے ۔ انہوں نے ''ایلائنز،، کے نام سے ایک فنی انجمن قائم کی جس کے بعد سے فن کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ۔ ان میں سے دو تین تجریدی فن کے دلدادہ تھے اور ایک نے سب سے پہلے دو قدم آگے بڑھا کر عورت کے عریاں جسم کو اپنا موضوع فن بنالیا ، لیکن باقی نے سابقہ فنی انداز اختیار کیا ۔ ان کی تخلیقات آبشاروں اور چٹانوں ، خاص طور سے برفپوش چٹانوں کے مناظر کو ابھارتی ھے ۔ ان میں سے جیرارڈ شنیدر کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ھے ۔

میرے مذکورہ بالا موقف کے مطابق ایک پینٹنگ تیار کرنے کے لیے مقامی فنکار کی خدمات کسی قدر سہل الحصول ہونگی ، لیکن دلی عقیدت کا رنگ تو وھی فنکار پیش کرسکتا ھے جو دین متین کا خود بھی پیرو ھو ۔ بہر نوع یہ میرا خیال ھے کہ کبھی نہ کبھی اس کو عملی جامہ پہنایا جائیگا ۔

## عالمی ادارۂ عمال

یہ ادارہ اقوام متحدہ کے قیام سے قبل وجود میں آیا تھا ۔

اس کی بنیاد ۱۱ اپریل ۱۹۱۹ء کو پڑی تھی ۔ اس وقت صلح نامہ وارسا کے تیرھویں حصے کے طور پر اس کا دستور شامل اوراق ہوا تھا ۔ ۱۹۴۶ء میں وہ اقوام متحدہ کا پہلا مخصوص ادارہ بن گیا ۔

اس کے مقاصد میں معاشرتی انصاف کی ترویج کے ذریعہ سے دیرپا امن قائم کرنے میں مدد دینا ، بین الاقوامی کارروائی کے ذریعہ سے مزدوروں کی حالت اور معیار زندگی کو سدھارنا اور اقتصادی اور معاشرتی استواری کو فروغ دینا شامل ہے ۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ادارہ حکومتوں ، مزدوروں اور مالکوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے ، تاکہ بین الاقوامی کم سے کم معیار کا تعین کیا جاسکے ۔ نیز مزدوروں کے معاملے میں ایسے معاہدے کیے جائیں جن کا تعلق اجرت ، کام کے اوقات ، مزدوری کے لیے کم سے کم عمر کے تعین ، مختلف قسم کے کام کرنے والوں کے حالات کار ، مزدوروں کے معاوضے ، معاشرتی بیمے ، تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں ، کارخانوں میں حفاظت کے سامان ، روزگار دلانے والے دفتروں ، مزدوروں کے معائنے اور انجمن بنانے کی آزادی وغیرہ سے ہو ۔ یہ ادارہ حکومتوں کے لیے بڑے پیمانے پر بھی امداد فراہم کرتا ہے اور رسالے اور کتابیں اپنے موضوع سے متعلق شائع کرتا ہے ۔ نیز اس کی طرف سے معاشرتی ، صنعتی اور مختلف متعلقہ امور پر رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔

ادارے کی جنرل کانفرنس سب سے اعلا اختیارات کی جماعت ہے ۔ اس کا اجلاس ہر سال ہوتا ہے ۔ اس میں شرکت کے لیے دو نمائندے ہر حکومت کی طرف سے اور ایک ایک نمائندہ مالکوں اور مزدوروں کی طرف سے آتا ہے ۔ اس کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ معاہدوں کی صورت میں بین الاقوامی معاشرتی معیار مقرر کرے ۔

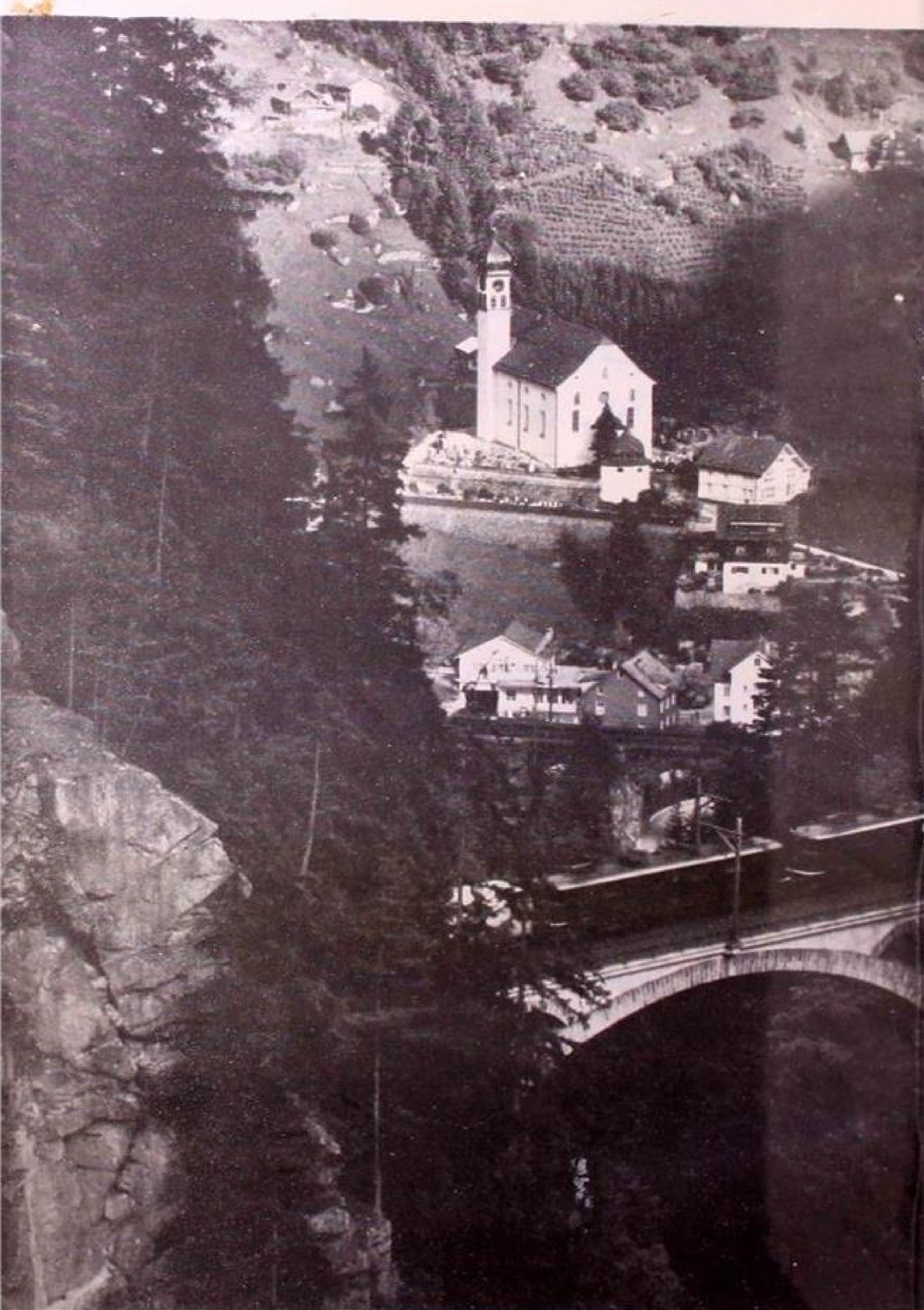
اس کی انتظامیہ کمیٹی اڑتالیس اراکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں سے چوبیس اراکین حکومتوں کی طرف سے اور بارہ مزدوروں کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ یہ کمیٹی بین الاقوامی دفتر عمال کے کام کی اور اس ادارے کی مختلف کمیٹیوں اور کمیشنوں کے کاموں کی نگرانی کرتی ہے۔

بین الاقوامی دفتر عمال، جس کا عملہ کانفرنس اور انتظامیہ کے سکریٹریٹ کا کام کرتا ہے، معلومات جمع کرتا اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ اگر کوئی حکومت درخواست کرے تو کانفرنس کے فیصلے کے مطابق قوانین کا مسودہ تیار کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ معاہدوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے ذرائع مہیا کرتا ہے اور اشاعت کا کام بھی اس کے سپرد ہے۔ ادارے کے فنی امداد والے پروگرام کو عملی جامہ پہناتا ہے۔

## ڈوکومنٹ سنٹر

تقریباً گیارہ بجے مسٹر ہینس نے عالمی ادارۂ عمال کی نئی عمارت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے لیے مجھے ایک خاتون کے ساتھ بھیج دیا اور میں یورپ کی اس عظیم الشان عمارت کو آدھ گھنٹے تک گھوم پھر کر دیکھتا رہا۔ خاتون موصوفہ اس کے بہت سے حصوں پر روشنی ڈال کر مجھے ان کی حقیقت سمجھاتی رہیں۔ حالیہ مقاصد کے اعتبار سے استعمال ہونے والی عمارتوں میں یہ یورپ کی سب سے بڑی عمارت ہے جس میں ہر قسم کی سہولت ہر لحاظ سے موجود ہے۔

آخر میں جناب جی تھامس صاحب نے مجھے سنبھال لیا۔ ان کا تعلق ادارے کے ڈوکیومنٹ سنٹر سے ہے۔ ادارے کی لائبریری اب مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہے۔ میں نے اُس نظام کو بہت ہی انہماک اور دل چسپی کے ساتھ دیکھا اور سمجھا۔ ظاہر



گوٹ ھارڈ کی ۶ سو فیٹ اونچی پہاڑی پر مسجد اور مسلمانوں کی بستی جو ریلوے لائن کے قریب ہے۔

ہے کہ یہ چھوٹے اداروں کے لیے تو موزوں نہیں ہے جبکہ عالمی اداراۂ عمال کے محدود موضوعات کے لیے بھی یہ گراں پڑیگا ۔ مگر اس نظام نے کتب خانہ جات کے کاموں کو اب اس درجہ سہل کردیا ہے کہ اس میں کسی غلطی کا امکان ھی باقی نہیں رہتا ۔ جناب تھامس صاحب اس کے نگراں ھیں ۔ انہوں نے بذات خود مجھے اس مرکز کا ھر شعبہ دکھایا ، اور کمپیوٹر کا استعمال بھی عملی اعتبار سے مجھے دکھاتے رہے ۔

## نماز جمعہ

پون بجے میں جناب شہید صاحب کے دفتر میں واپس آگیا ۔ وہ بھی اپنی ایک میٹنگ ختم کرکے واپس آچکے تھے ۔ ہم دونوں نے کیفے ٹیریا میں دودھ نوش کیا اور پھر مرکز اسلامی میں آگئے ۔ یہاں بڑے اطمینان اور خضوع و خشوع کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی ۔ جناب امام صاحب مراکش کے باشندے ھیں ۔ انہوں نے عربی اور فرانسیسی زبانوں میں خطبہ دیا ۔ کافی تعداد میں نمازی موجود تھے ۔ ان میں مقامی باشندے بھی تھے اور غیر ملکی بھی ۔ مجھے بتایا گیا کہ جمعہ کے علاوہ باقی دنوں میں اور دوسری نمازوں میں نمازیوں کی تعداد برائے نام ھوتی ہے ۔ پاکستانی صرف ھم چار افراد تھے ۔ پاکستان کے مستقل مشن متعینہ سوئزرلینڈ کا کوئی رکن شریک نماز نہیں ھوا اور نہ دوسرے اسلامی ممالک کے سفرا یہاں موجود تھے ۔ مجھے اس اعتبار سے بہت ھی افسوس ھوا ۔

جناب شہید صاحب نے ڈھائی بجے مجھے ھوٹل تک پہنچا دیا ۔

## بین الاقوامی انجمن صلیب احمر

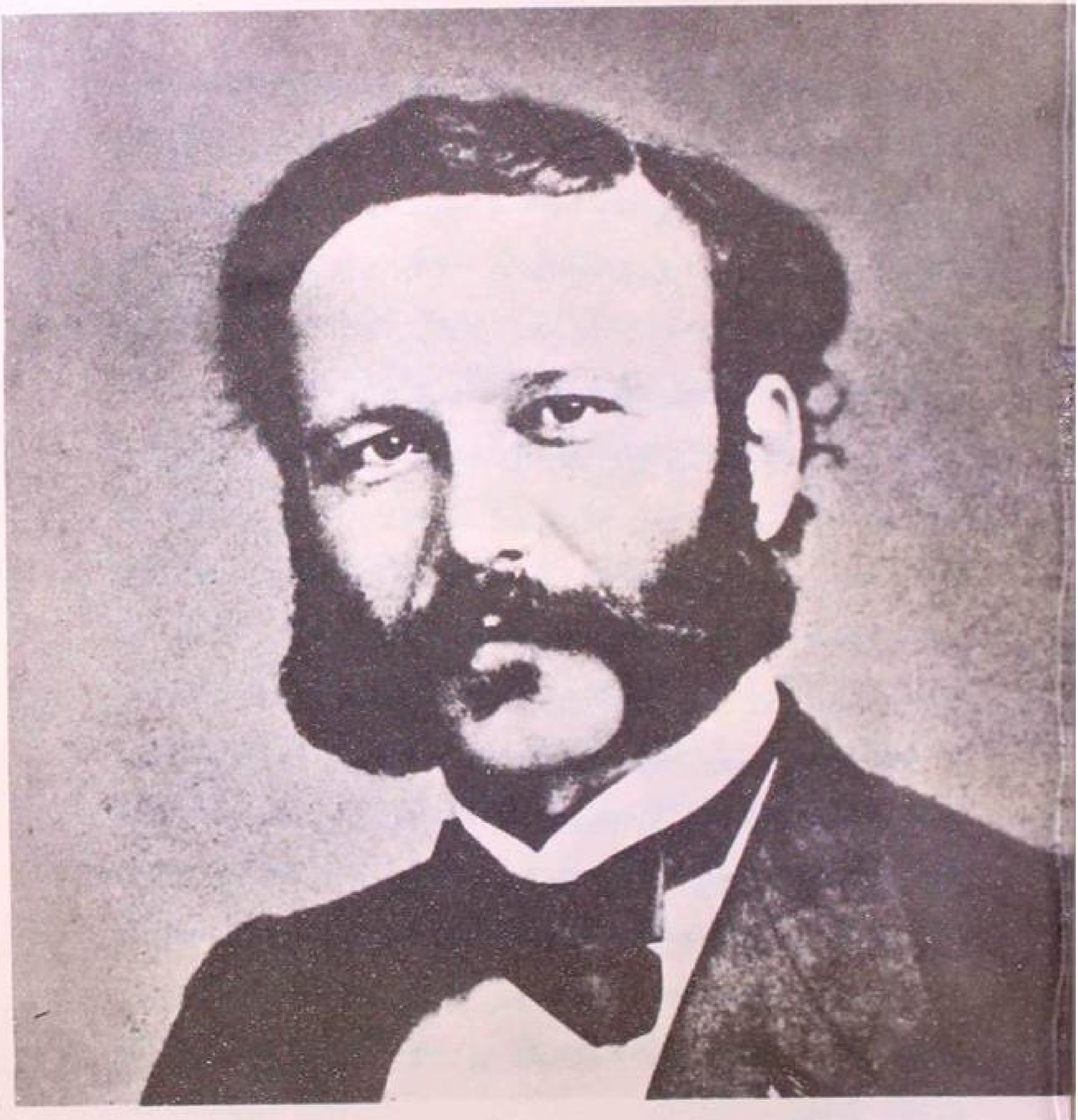
تین بجے کے قریب بین الاقوامی انجمن صلیب احمر ( آئی

سی آر سی ) کی جانب سے موٹر آگئی اور میں سعدیہ ، فاخرہ اور خانم ڈی سلوا کے ساتھ روانہ ہوگیا ۔ اس بین الاقوامی انجمن کے صدر دفتر کا محل وقوع بہت ہی عجیب ہے ۔ یہ چاروں طرف سے دوسرے بین الاقوامی اداروں سے گھرا ہوا ہے ۔ اس کے سامنے اقوام متحدہ کا یورپی دفتر ہے ۔ اس کی پشت پر عالمی ادارۂ عمال کا دفتر ہے ۔ دائیں طرف عالمی ادارۂ صحت کا اور بائیں طرف عالمی ادارۂ محنت کشاں کے دفاتر ہیں ۔ عمارت بہت ہی عظیم ، شان دار اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے ۔

ہم سب یہاں پہنچے تو قومی انجمنوں کی افسر رابطہ محترمہ ایم شربو لائز نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا ۔ ان کے ساتھ ایک اور خاتون مسز شیریندر صاحبہ موجود تھیں ۔ مسز شربولائز نے خیر مقدمی الفاظ کے ساتھ پروگرام کی ایک نقل ہم کو دے دی ۔ یہ پروگرام میمیو گراف یعنی سائکلو اسٹائل کیا ہوا تھا ۔ مطلب یہ کہ اس کی متعدد کاپیاں کر کے متعلقہ دفاتر کو پہنچادی گئی ہونگی ۔ چنانچہ ایک نقل انجمن صلیب احمر کے دفتر میں بھی آگئی تھی ، تاکہ اس کے مطابق انتظامات کئے جائیں ۔

## انجمن ہائے صلیب احمر

۱۸۶۲ء میں ملک کے ایک خدا ترس اور مخیر انسان کے ایما پر جنیوا کے ایک فلاحی ادارے کے زیر اہتمام بین الاقوامی نوعیت کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا جو میدان جنگ میں زخمی ہونے یا بیمار پڑنے والے سپاہیوں اور دوسرے فوجیوں کی دیکھ بھال کا کام انسان دوستی کی بنیاد پر کرسکے ۔ اصل خیال ژین ہنری دونانت کا تھا جو سولفرینو کے محاذ جنگ پر زخمی سپاہیوں اور فوجیوں کی حالت زار بچشم خود دیکھ آئے تھے ۔ بیکسی اور بیچارگی کے عالم میں تڑپتے ہوئے



سولفرینو کی جنگ کے موقع پر ہنری دونات نے انجمنِ صلیبِ احمر قائم کی۔

انسانوں کو دیکھ کر ان کا دل جذبۂ رحم سے بیتاب ہوگیا تھا - لڑائی تقریباً ختم ہوچکی تھی - اور بہادر جنگجو جو اپنی حالت زار کے باعث اب کسی سے بھی داد شجاعت لینے کے اھل نہیں رہے تھے، کس مپرسی کے عالم میں وہاں پڑے سسک رہے تھے - فاتح اور مفتوح دونوں قومیں محاذ جنگ سے جاچکی تھیں - صرف ان کے مذموم نتائج و آثار زمین کے سینے پر باقی رہ گئے تھے -

اس ادارے کے قیام سے قبل جنیوا میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں یورب کے سولہ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے - ھنری دونانت کا موقف لائق تحسین اور قابل احترام تھا - ان کی ابتدائی تقریر، جس میں مقصد اجتماع کی وضاحت کی گئی تھی بہت ھی موثر ثابت ہوئی - اختلاف رائے کی گنجائش ھی نہیں تھی - اچھی بات کو سبھی پسند کرتے ھیں - لہذا دوسرے مندوبین نے بھی تائید کی اور اپنے اپنے ملکوں کی طرف سے دامے، درمے، قدمے بھرپور اعانت کا یقین دلایا - اجلاس نے اتفاق رائے کے ساتھ ایک مسودۂ قانون بھی منظور کیا جس کی رو سے انجمن صلیب احمر وجود میں آگئی - جملہ اراکین نے توثیق کرتے ہوئے اس مسودے پر ۲۳ اگست ۱۸۶۴ء کو دستخط کردیے -

ریاست ھائے متحدہ امریکا عموماً ایسی تنظیمات میں شامل نہیں ہوتا جن کی تحریک یورپ کے کسی ملک سے شروع ہوئی ہو، لیکن اس انجمن کے کارھائے نمایاں اتنے جاذب نظر تھے کہ وہاں کی حکومت کو ایک لمحۂ فکر اس ضمن میں صرف کرنا پڑا - ۱۸۸۱ء میں کلارا بارٹن کے زیر اہتمام اس انجمن کی شاخ واشنگٹن میں قائم کردی گئی اور نو سال بعد اس نے اپنا پہلا وفاقی منشور بھی طے کرلیا جو اصل انجمن کے منشور سے کسی

عنوان مختلف نہیں تھا - ۱۹۰۵ء میں حکومت نے باقاعدہ اس کی سرپرستی کرتے ہوئے اسے سرکاری حیثیت دیدی جو اس وقت تک نصیب نہیں ہوئی تھی -

اس انجمن کے اغراض و مقاصد فلاحی نوعیت کے تھے - یہ طے پایا تھا کہ زخمی اور بیمار سپاہیوں اور فوجیوں کی دیکھ بھال ، مرہم پٹی ، علاج معالجہ اور غذائی سہولتوں کے اہتمام میں دستخط کنندہ ممالک ، جب بھی ان سے امداد طلب کی جائے ، کسی تعصب کے بغیر حصہ لینگے - وہ اس پہلو پر بھی کبھی غور نہیں کرینگے کہ لڑائی کن ملکوں کے درمیان ہوئی ، سبب جنگ کیا تھا ، صحیح یا غلط قدم کس نے اٹھایا تھا ، ہار یا جیت کس ملک یا قوم کی ہوئی - بالفاظ دیگر معذور لوگوں کی فلاح و بہبود خالص انسانی نقطۂ نظر سے کی جائیگی - امداد کے ضمن میں نقد رقوم کے علاوہ دوائیں ، مرہم پٹی کا سامان ، غذائی اشیا ، اور طبی عملہ حسب ضرورت طلب کیا جائیگا - اور جہاں تک ممکن ہوگا ، رکن ممالک مطالبات کو پورا کیا کرینگے - خواہ وہ براہ راست یا بالواسطہ اس لڑائی میں ملوث ہی کیوں نہ ہوں - کوئی ملک رضا کارانہ طور پر امداد دینا چاہے تو اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائیگا -

ایک مختصر صلیب کے انداز میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی برابر کی دو افقی اور راسی پٹیاں سرخ رنگ سے سفید زمین پر بنائی گئیں جو اس انجمن کا خصوصی نشان قرار پائیں - یہ فیصلہ مان لیا گیا کہ اگر کسی فرد ، کسی دستے ، کسی گاڑی یا کسی عمارت پر یہ نشان لگا ہوا نظر آئے تو ہر حالت میں اس کا احترام کیا جائیگا اور کسی بھی صورت میں اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی جائیگی - اور یہ حقیقت اطمینان بخش کہی

جاسکتی ہے کہ اس وقت سے آج تک اس فیصلے کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ حالت جنگ یا معرکہ آرائی کے دوران میں بھی اگر یہ سرخ نشان کسی گاڑی یا عمارت پر نظر آگیا تو ہرگز اسے نشانہ نہیں بنایا گیا ۔ حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جو اس انجمن کے رکن نہیں بنے ہیں اور بالکل غیر جانبدار ہیں ، اس نشان کا خیال رکھتے ہیں ۔ سفید زمین پر سرخ صلیب کا نشان ایک لحاظ سے سوئزرلینڈ کے قومی پرچم کے نشان کو بالکل الٹ کر تیار کیا گیا ہے جو سرخ زمین پر سفید صلیب کو ظاہر کرتا ہے ۔

اسلامی ملکوں کے ارباب اقتدار نے اس بین الاقوامی انجمن کے اغراض و مقاصد سے اختلاف رائے نہیں کیا ۔ انہوں نے ان کو ہر لحاظ سے مفید بلکہ تقاضائے وقت کے لحاظ سے ناگزیر سمجھا ۔ البتہ ذراسی ترمیم تجویز کی ۔ یعنی اسلامی ملکوں میں اس کا نام انجن صلیب احمر کے بجائے انجمن ہلال احمر رکھا جائے ۔ چونکہ بنیادی اعتبار سے کوئی اختلاف رائے نہیں تھا اس لیے نام کی تبدیلی پر انجمن کی تنظیمی کمیٹی نے اعتراض نہیں کیا ۔ اسی طرح صرف ایران نے ایک اسلامی ملک ہونے کے باوجود انجمن ہلال احمر سے بھی قطع نظر اپنے لیے انجمن شیرو خورشید تجویز کیا اور چونکہ شیرو خورشید ان کے قومی نشانات ہیں ، اس تجویز کو بھی قابل اعتراض نہیں سمجھا گیا ، اس لیے کہ صرف نام کے اختلاف سے اصل مقصد فوت نہیں ہوتا ہے ۔ لہذا اس انجمن کی شاخیں مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں ، ایران ، افغانستان اور پاکستان کے علاوہ سوویت یونین کی مسلم ریاستوں میں بھی قائم ہوگئیں ۔

شروع میں انجمن صلیب احمر کے زیر ایوان ایک بین الاقوامی کمیٹی قائم کی گئی جس میں صرف سوئزر لینڈ کے پچیس باشندے شامل کئے گئے ، لیکن جوں جوں دوسرے ممالک

عملی طور پر حصہ دار بنے اور انھوں نے انجمن کی شاخیں اپنے اپنے ملک میں قائم کرلیں تو ان کے نمائندوں کو بھی اس کمیٹی میں شامل کرلیا گیا۔

پھر ۱۹۱۹ء میں ان سب کو ملا کر انجمن ہائے صلیب احمر و ہلال احمر وغیرہ کی لیگ قائم کرلی گئی۔ اس وفاق سے ایک ملک کی انجمن کا دوسرے ملک کی انجمن سے رشتہ قائم ہوگیا۔ اس لیگ کے جلسے ہر چوتھے سال کسی ایک ملک میں منعقد ہوتے ہیں اور بین الاقوامی نوعیت کے مسائل فلاح و بہبود پر تبادل خیالات کیا جاتا ہے۔

جب پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے امن و عافیت کی فضا قائم رہی تو انجمن ہائے صلیب احمر نے نئے زاویۂ نظر سے اپنے لائحۂ عمل پر غور کیا اور لڑائی میں زخمی ہونے یا بیمار پڑنے والے سپاہیوں اور فوجیوں کے علاوہ ان ستم رسیدہ افراد کو بھی اس زمرے میں شامل کرلیا جو کسی وبائی مرض کے پھیلنے، طوفانی سیلاب، زلزلے یا آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے متاثر ہوئے ہوں اور بے سرو سامان رہ جانے یا ان قدرتی آفاق کے ہاتھوں زخمی یا بیمار ہوجانے کے باعث امداد کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس طرح اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع اور ہمہ وقتی ہوگیا ہے۔

ادارے کا مختصر تعارف کرانے کے بعد سنٹرل ٹریننگ ایجنسی کا شعبہ دکھایا گیا۔ یہاں تقریباً ان ۴۵ ملیون یعنی چار کروڑ پچاس لاکھ زخمی فوجیوں کا ریکارڈ موجود ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران میں تختۂ مشق بنائے گئے تھے۔ پاکستان اور ہندستان کے درمیان جو مختلف جھڑپیں ہوتی رہی ہیں، ان میں کام آنے والے شہیدوں اور زخمیوں کا ریکارڈ بھی رکھا گیا ہے۔

اسی طرح بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان جو تبادلۂ آبادی ہوا ، اس کی تفصیلات بھی یہاں مل سکتی ہیں ۔ ہم نے اپنے محمد یونس کو تلاش کرنا چاہا ، لیکن کوئی سراغ مل نہیں سکا۔ شاید اس لیے کہ ہمارے پاس مفصل حوالے نہیں تھے جن سے ریکارڈ کو تلاش کیا جاتا ہے ۔ مسز وندرا نے اس شعبے کی مفصل کارکردگی پر روشنی ڈالی ۔ وہ خود بھی بنگلہ دیش میں چھے ماہ کام کر آئی ہیں ۔

جناب ایل ڈیسلارزس سے ملاقات ہوئی ۔ یہ ایشیا اور اوشینیا والے علاقے کے مندوب ہیں ۔ انھوں نے اپنے طریقۂ کار کی تفصیلات بتائیں ۔ پاکستان بھی ان کے دائرۂ عمل میں شامل ہے ۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ پاکستان کے لیے انجمن صلیب احمر کے سالانہ بجٹ میں کتنی رقم رکھی گئی ہے ۔ ان سے معلوم ہوا کہ کم و بیش تین لاکھ روپے سالانہ رکھے جاتے ہیں ، لیکن اگر کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جائے ، یعنی سیلاب ، طوفان یا زلزلہ آجائے یا کوئی وبائی بیماری اپنا رنگ جمالے یا بڑے پیمانے پر کسی ہنگامہ آرائی میں جسمانی اذیت پہنچے تو ان حالات کے پیش نظر رقم میں اضافہ کردیا جاتا ہے ۔ پاکستان میں اس انجمن کی شاخ ”ہلال احمر“ کہلاتی ہے ۔

پاکستان میں صلیب احمر کو ہلال احمر کرانے میں مجھے خاصی تگ و دو کرنی پڑی تھی ۔ اس کے لیے سب سے پہلے میں نے ہی اپنے ہاں شہریوں کی ایک میٹنگ طلب کی تھی اور اس کے بعد ہی یہ تحریک چلی ۔ نام کی تبدیلی میں امر مانع حسابات کا مسئلہ تھا جو بالآخر حل ہوا ۔ اور انجمن کا نام ہلال احمر قرار دیدیا گیا ۔

سب سے آخر میں اس عالمی انجمن کے صدر محترم جناب

ڈاکٹر ایرک مارٹن سے شرف ملاقات حاصل ہوا ۔ ان کے ساتھ موسیوڈس ٹوز بھی تھے ۔ وہ ایشیا کی نمائندگی کرتے ھیں ۔ ڈاکٹر ایرک مارٹن انجمن کی تاریخ میں پہلے صدر ھیں جو ڈاکٹر اوف مڈیسن ھیں ۔ ان سے قبل نامزد ھونے والے صدر پیشۂ طب سے تعلق نہیں رکھتے تھے ۔ انہوں نے میری بچیوں اور میری سکریٹری کی تواضع چائے سے کی ۔ میں نے دودھ کا ایک گلاس نوش جان کیا ، مگر سب سے بڑی تواضع انہوں نے اپنے مشفقانہ طرز عمل اور سلوک سے اور اپنے عالمانہ و مدبرانہ انداز سے کی ، جسے بہت زیادہ قابل قدر کہا جاسکتا ھے ۔ ان میں حقیقتاً وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو انسان دوستی والے اس ادارے کے صدر کے لیے لازمی قرار دی جاسکتی ھیں ۔ ان سے باتیں کر کے دل کو بڑی مسرت حاصل ھوئی ۔ جی چاھا کہ اس ملاقات کا سلسلہ ذرا دراز ھوجائے ۔ مجھے وہ لوگ بہت پسند ھوتے ھیں کہ جن کو اپنے فرائض منصبی خلوص و محبت کے ساتھ ادا کرنے کا احساس ھوتا ھے ۔ تاھم اگر موسیوڈس ٹو ز اس صحبت میں شریک نہ ھوتے تو زیادہ اچھا ھوتا ۔ ان کا طبعی رجحان بالکل برعکس تھا ۔

میں نے ڈاکٹر ایرک مارٹن کو اپنے مقالۂ برن کی ایک کاپی پیش کی ۔ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ میں جامعۂ برن میں مقالہ پڑھنے آیا تھا ۔ انہوں نے مقالے پر سر سری نظر ڈالتے ھوئے دلچسپی لی اور کہا کہ میں بالاستیعاب اس کا مطالعہ کرونگا ۔ اپنی ذاتی رائے ظاھر کرتے ھوئے انہوں نے فرمایا کہ مناسب یہی ھے کہ قدیم طریقہ ھائے علاج کو فراموش یا نظر انداز نہ کیا جائے ۔ صحت کے ضمن میں ھر انداز فکر کا احترام اور اس سے استفادہ کرنا چاھیئے ۔ انہوں نے خواھش ظاھر کی کہ میں مقالے کی اس کاپی پر اپنا آٹو گراف دوں ۔ میں نے چند مناسب

الفاظ لکھ کر دستخط کردیے ۔

ساڑھے پانچ بجے یہ سلسلہ ملاقات ختم ہوا ۔ اس بین الاقوامی انجمن نے جو انسانی خدمات انجام دی ہیں اور دے رہی ہے ، وہ حقیقتاً قابل تعریف ہیں ۔ چنانچہ دل و دماغ پر مرتسم ہوجانے والے اثرات کے ساتھ ہم وہاں سے رخصت ہوئے ۔

یادوں کے چراغ میرے نہاں خانہ قلب میں روشن ہوگئے۔ بے چینی میں قدرے اضافہ ہوگیا ۔ سوچ کی نگری میں پہنچ کر میں اکثر منصوبے بناتا ہوں کہ مجھے بھی مرنے سے قبل انسان دوستی کا کوئی کارنمایاں انجام دینا چاہئے ۔ ہمدرد سے وابستہ میری خدمات قابل وقعت سمجھی جاتی ہیں ۔ تاہم میں بڑے پیمانے پر ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جو اپنی افادیت کے اعتبار سے بین الاقوامی نوعیت اختیار کرلے ۔ اس کا دائرہ صرف قومی حدود تک نہ رہے — اگر میرے ملک کے حالات مایوس کن نہ ہوں تو میں ضرور زیادہ مفید کام کرنے کا اہل ہوں ۔

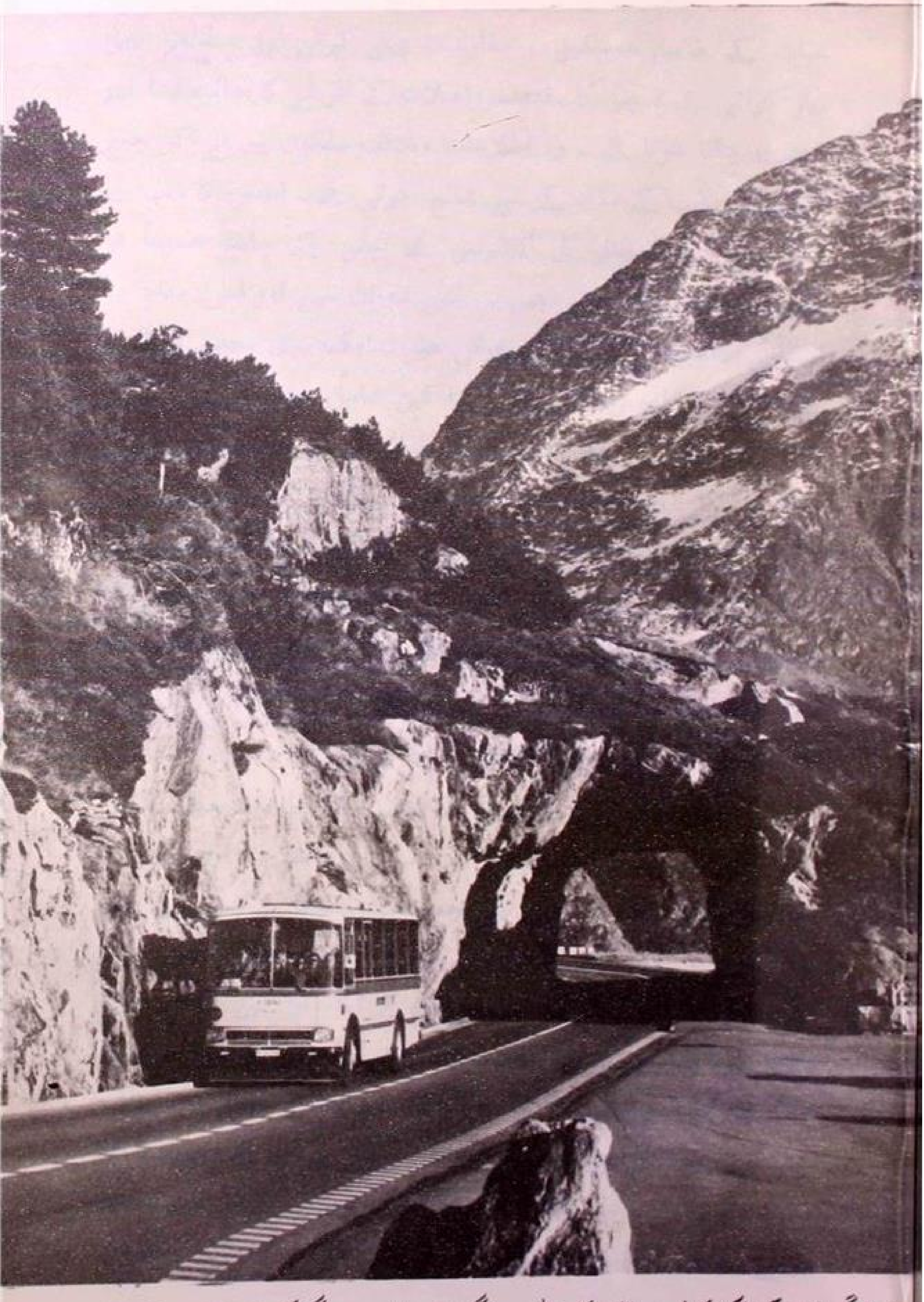
## عالمی اداروں کا مرکز

انجمن صلیب احمر کے علاوہ جنیوا اور بھی بہت سے بین الاقوامی اداروں کا مرکز ہے ۔ اس کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں ، لیکن میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ سوئزر لینڈ ہمیشہ امن پسند ملک رہا ہے ۔ اس نے خود کسی عالمگیر جنگ میں براہ راست یا بالواسطہ حصہ نہیں لیا ۔ اس طرح ہر بین الاقوامی ادارے کا مرکز وہاں بالکل محفوظ رہ سکتا ہے اور واقعی محفوظ رہا ہے ۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی اس کا محل وقوع دل پسند ہے ۔ اداروں کے اراکین اپنے سالانہ یا وقتی جلسوں میں شریک ہوکر وہاں بڑی راحت محسوس کرتے ہیں ۔ اقوام متحدہ کے یورپی دفتر ، دوسرے دفاتر اور اس کے مخصوص اداروں

کے دفتروں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان میں سے بیشتر دفاتر قصر اقوام میں واقع ہیں جو ایک عظیم الشان وسیع و عریض تاریخی عمارت ہے۔ جنیوا کے علاوہ اس ملک کا ایک اور شہر برن بھی چند بین الاقوامی اداروں کا مرکز ہونے کے باعث خاصی اہمیت حاصل کرگیا ہے۔ میرے نزدیک اس موقع پر ان میں سے بعض اداروں کا اجمالی ذکر بے محل نہیں ہوگا۔

## مواصلات کی بین الاقوامی انجمن

ابتداً یہ انجمن پیرس میں ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی تھی اور اس وقت تار کی بین الاقوامی انجمن کہلاتی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں اس نام کو بدل کر موجودہ نام اختیار کیا گیا اور قدرتی طور پر اس کا دائرۂ عمل زیادہ وسیع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی تار اور ریڈیائی تاروں کے رائج الوقت ضابطے کالعدم کرکے ان کی جگہ مواصلات کا بین الاقوامی ضابطۂ قانون بنالیا گیا۔ میڈرڈ میں اس ضابطے کی توثیق ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں اس انجمن کی از سر نو تنظیم ہوئی اور ایک معاہدے کے تحت اس کا الحاق اقوام متحدہ سے ہوگیا جس کی رو سے وہ اس کا ایک مخصوص ادارہ سمجھا جانے لگا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں تار، ٹیلے فون اور ریڈیو خدمات کے سلسلے میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا، ان تینوں محکموں کی ترقی کو پروان چڑھانا اور عام استعمال کے لیے ان کو رائج کرنا شامل ہے۔ یہ انجمن خاص طور پر ریڈیو کی برقی لہروں کا تعین کرتی اور لہروں کے ان تفویض ناموں کو رجسٹر کرتی ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کے درمیان نقصان دہ مداخلت کو کم کرنے کی کوششوں میں تعاون پیدا کراتی ہے۔ باہمی رابطہ قائم کرتی ہے تاکہ کم سے کم نرخ مقرر کیے جاسکیں۔ نیز ایسے طریقے اختیار کرتی ہے جو مواصلاتی خدمات کے تعاون سے سلامتیٔ



موسم گرما میں محکمۂ ڈاک کی بسیں پہاڑیوں کی چوٹیوں، سرنگوں اور وادیوں سے گزر کر اپنی خدمات انجام دیتی ہیں۔

حیات کے ضامن ہوسکیں ۔ سفارشات پیش کرتی اور مطالعے بھی تیار کراتی ہے ، جن کا مقصد مواصلات کے طریقے کا جائزہ لینا اور قاعدے بنانا ہوتا ہے ۔ وہ اطلاعات مختلف ملکوں سے لے کر جمع کرتی اور سب کے مفاد کے لیے شائع کرتی ہے ۔ انجمن کا سب سے اعلا عضو ایک مختار کل کانفرنس ہے جس کے جلسے عموماً ہر پانچویں سال منعقد ہوتے ہیں ۔ اسی دوران میں اور اسی مقام پر انتظامی کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی ہیں ۔ ایک بڑی مجلس انتظامیہ ہے جس میں انجمن کے پچیس اراکین شامل ہوتے ہیں ۔ انھیں مختار کل کانفرنس صحیح جغرافیائی نمائندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے منتخب کرتی ہے ۔ اس کے اجلاس عموماً ہر سال ہوتے ہیں ، لیکن اگر ضروری سمجھا جائے یا اس کے چھے اراکین درخواست کریں تو حسب ضرورت بھی ہوسکتے ہیں ۔ یہ مجلس مختار کل کانفرنس کے دو اجلاسوں کے درمیان اس کی طرف سے انتظامی کام بھی کرتی ہے ۔ نیز سالانہ میزانیہ منظور کرتی ہے ۔

## ڈاک کی عالم گیر انجمن

یہ انجمن بھی مذکورہ بالا انجمن کی طرح پچھلی صدی میں یعنی یکم جولائی ۱۸۷۸ء کو قائم ہوئی تھی ۔ اس سے قبل معاہدۂ برن کی توثیق ہوئی تھی جسے سوئزر لینڈ کے شہر برن میں ۹ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو بائیس ملکوں کے نمائندوں نے منظور کرلیا تھا ۔ اس کے اغراض و مقاصد میں اس کے تمام اراکین کو اس طرح متحد کرنا شامل ہے کہ ڈاک کے باہمی تبادلے کے ضمن میں وہ ایک علاقہ تصور ہوں تاکہ ڈاک کی خدمات کو منظم و مربوط، بہتر اور بین الاقوامی نوعیت کا بنایا جاسکے ۔ اس کے بموجب ہر ملک باقی تمام رکن ملکوں کو ڈاک کی ترسیل کے لیے وہی اعلا طریقے اختیار کرتا ہے جو وہ اپنی اندرونی ڈاک کے لیے استعمال

کرتا ہے ۔ گویا انجمن کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ڈاک کی ان مختلف بین الاقوامی خدمات کا خیال رکھے جو رکن ملکوں میں ڈاک کے محکمے انجام دیتے ہیں ۔ ڈاک کا عالمگیر ضابطہ؛ قانون اور ڈاک کی عالمگیر انجمن کے دوسرے آئین اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ ڈاک کا بین الاقوامی تبادلہ ان اصولوں اور طریقوں کے مطابق ہو جن کو زیادہ تر معیاری سمجھ لیا گیا ہے ۔ اس سے متعلق ڈاک کی ایک عالمگیر کنگرس ہے جو تمام اراکین پر مشتمل ہوتی ہے ۔ اس کے اجلاس عموماً ہر پانچ سال بعد ہوتے ہیں ۔ یہ ڈاک کے عالمگیر ضابطے اور اس کے ضمنی معاہدوں کا ان تجاویز کی روشنی میں جائزہ لیتی ہے ، جو رکن ممالک پیش کرتے ہیں ۔ دو تہائی اراکین کی درخواست پر اس کا غیر معمولی اجلاس بھی طلب کیا جاسکتا ہے ۔

اس کی ایک مجلس عاملہ بھی ہے جو ستائیس اراکین پر مشتمل ہے جن کو کنگرس جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے منتخب کرتی ہے ۔ وہ ڈاک کے محکموں سے قریبی تعلق قائم رکھتی ہے ، اپنے بیورو پر کسی قدر کنٹرول کرتی ہے ، اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کے ساتھ عملی تعلقات قائم کرانے کے لیے یقین کی صورت پیدا کرتی ہے ، مشورے دینے کے لئے تیار رہتی ہے ، مطالعے کرتی ہے اور کنگرس کے سامنے تجاویز پیش کرتی ہے ۔

ڈاک کے معاملات کا مطالعہ کرنے والی ایک مشاورتی کمیٹی ہے جس میں انجمن کے سارے اراکین شریک ہوتے ہیں ۔ اس کا کام یہ ہے کہ ڈاک کی خدمات کے سلسلے میں فنی ، اقتصادی اور کارکردگی کے معاملات کا مطالعہ کرے اور مشورے دے ۔ بیس اراکین پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی ہے جس کا

اجلاس سال میں ایک بار ہوتا ہے ۔ یہ مشاورتی کمیٹی کے عملی منصوبوں میں رابطہ اور مطابقت پیدا کرتی ہے ۔ ایک بین الاقوامی بیورو ہے جو انجمن کا مستقل سکریٹریٹ ہے ۔ یہ ڈاک کے محکموں کے لیے ذریعہٴ تعلقات عامہ ثابت ہوتا ہے ، اطلاعات فراہم کرتا ہے اور مشورے دیتا ہے ، اور بین الاقوامی ڈاک رسانی کے سلسلے میں حسابات چکاتا ہے ۔ گویا اس مقصد کے لیے وہ ایک ''کلیرنگ ہاؤس ،، کا کام دیتا ہے ۔

## عالمی ادارہٴ صحت

سوئزر لینڈ میں بہ مقام جنیوا میری دل چسپی کا سب سے اہم ادارہ عالمی ادراہٴ صحت ہے ۔ میرا اس ادارے سے گہرا اور قدیم تعلق ہے ۔ میرا ہمیشہ یہ اصرار رہا ہے کہ افریقہ اور ایشیا میں اگر صحت عامہ کا مسئلہ حل کرنا ہے تو ان ممالک میں علاقائی طبوں ( ٹریڈیشنل مڈیسن ) کو شریک کرنا ہوگا ۔ میرا دوسرا اصرار یہ رہا ہے کہ جب تک عالمی ادارہٴ صحت کے حیطہٴ عمل میں علاقائی طبیں اور طب اسلامی ، طب چینی اور طب ہندی شریک نہیں کی جاتیں یہ ادارہ عالمی نہیں ہے ، مغربی ہے اور محض طب مغربی کا ترجمان ہے ۔

پاکستان میں طب کے لیے تحریک شروع کرنے کے بعد میں نے عالمی ادارہٴ صحت سے اپنا رابطہ ہمیشہ قائم رکھا ہے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہ میں اپنے نقطہٴ نظر پر اصرار نہ کروں ۔ میں نے تحریر و تقریر کے ذریعہ سے ہمیشہ اصرار کیا کہ طب کو یہ ادارہ تسلیم کرے ۔ اپنے اس نقطہٴ فکر کو تسلیم کرانے کے لیے میں بارہا اس کے صدر دفتر ، جنیوا آیا ہوں ، اسکندریہ گیا ہوں ، امریکا گیا ہوں ، بنکاک گیا ہوں ، نئی دہلی گیا ہوں ۔ میں نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا ہے اور بالآخر

میں نے اپنی بات کو اس عالمی ادارۂ صحت سے تسلیم کرالیا ہے۔ ہنوز اس نے واضح اعلان نہیں کیا ہے تاہم میں اس وقت تک دم نہیں لوں گا جب تک یہ ادارہ طب کو تسلیم نہ کرلے۔ طب میری زندگی کا موضوع ہے۔ میں نے طب کے احیا و ترقی کے لیے زندگی وقف کی ہے، اس لیے طب کو اس کا صحیح مقام دلانا میرا منتہائے مقصود ہے۔ اور آج نہیں تو کل یہ ادارہ انشا اللہ تعالیٰ طب کو تسلیم کرے گا۔

بد قسمتی سے میرے ہم وطن ڈاکٹر پاکستان میں طب کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کو طب کی مخالفت کی بڑی گراں قیمت ادا کرنی ہوگی۔ وہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں صحت عامہ کا مسئلہ پیدا کررہے ہیں بلکہ وہ پاکستان میں طبی تحقیقات کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ میں بہر حال ان سے مایوس ہوکر اور ان کو ان کے حال زار پر چھوڑ کر بین الاقومی سطح پر طب کے لیے کام کر رہا ہوں۔ برن یونیورسٹی میں طب پر میرا لیکچر میری اسی جدوجہد کا مظہر ہے۔

اچھا ذرا اب اس ادارے کی تاریخ پر بات ہوجائے:

اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے ایما پر طلب کی ہوئی صحت کی بین الاقوامی کانفرنس نیو یارک میں ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوئی تو عالمی ادارۂ صحت (World Health Organization) کا دستور منظور کیا گیا۔ پھر جب ۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کے چھبیسویں رکن نے اس کی توثیق کردی تو یہ ادارہ دائرۂ وجود میں آگیا۔ تمام انسانوں کے لیے صحت کا بلند ترین معیار حاصل کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔

یہ ادارہ ساری دنیا میں تین قسم کی خدمات انجام دیتا ہے

جن میں الگ الگ ملکوں کی مدد کرنا اور طبی تحقیقات کی ہمت افزائی کرنا شامل ہے۔ اس کی خدمات میں، جن سے سارے ملکوں کو فائدہ پہنچتا ہے، روز کے روز چیچک، خسرہ، طاعون، ہیضے اور بین الاقوامی اعتبار سے دوسری اہم بیماریوں کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچانا شامل ہے۔ وہ بیماریوں، جسمانی تکالیف اور اموات کے اسباب کے بارے میں، جن کی بنیاد پر بہت سی قومیں اپنے صحی معیار کا خیال رکھتی ہیں، ایک بین الاقوامی فہرست شائع کرتا ہے۔ سب ملکوں کو انفرادی طور پر ان کی درخواست آنے کے بعد امداد دی جاتی ہے۔ مثلاً غیر ملکوں میں مطالعہ کے لیے وظیفے دینا، ملیریا کے استیصال میں مدد دینا یا مخصوص قسم کی خدمات کو بہتر بنانے میں اعانت کرنا۔ مثال کے طور پر دماغی صحت کو درست کرنا۔ علاوہ ازیں طبی تحقیقات کی ہمت افزائی کرنے کے سلسلے میں ادارے نے سرطان اور امراض قلب کی چھان بین کے لیے خاص اہتمام کیا ہے تاکہ مختلف ملکوں میں تحقیقاتی کام ایک ہی انداز میں کیا جاسکے۔ اس نے تجربہ گاہوں کا ایک بین الاقوامی نظام بھی قائم کر رکھا ہے تاکہ بیماری پیدا کرنے والے اسباب کا پتہ لگایا جاسکے، بہتر قسم کی ویکسین تیار ہوسکے اور تحقیقات کرنے والوں کو تربیت دی جاسکے۔

اس کی تنظیم میں عالمی صحت کی ایک اسمبلی شامل ہے جس میں ادارے کے جملہ اراکین کے نمائندے شریک ہوتے ہیں۔ یہ اسمبلی ادارۂ صحت کی پالیسی تیار کرتی ہے۔ ایک مجلس عاملہ ہے جس سے اراکین کی تعداد چوبیس ہوتی ہے۔ جنھیں عالمی صحت کی اسمبلی کی طرف سے منتخب شدہ اتنے ہی رکن ممالک نامزد کرتے ہیں۔ اس کے اجلاس سال میں دو بار ہوتے

ھیں ۔ یہ مجلس اسمبلی کی عاملہ کی حیثیت سے کام کرتی ھے ۔ اس کا ایک سکریٹریٹ ھے جس میں ایک ڈائرکٹر جنرل اور حسب ضرورت فنی اور انتظامی عملہ کام کرتا ھے۔ سکریٹریٹ کے ماتحت جغرافیائی اعتبار سے علاقائی دفاتر بھی قائم ھیں ۔ بحیرۂ قلزم کا علاقائی دفتر اسکندریہ میں قائم ھے ۔ پاکستان کا تعلق اسی سے ھے ۔

یہ ادارہ صحت عامہ کے موضوع پر ایک ماھنامہ مختلف زبانوں میں شائع کرتا ھے جن میں سے بعض شمارے کسی خاص موضوع طب کے لیے ھوتے ھیں ۔ ھمدرد نیشنل فاؤنڈیشن ایسے کئی شماروں کو اردو زبان میں شائع کرچکا ھے جو بہت مقبول ھوئے ھیں ۔

## عالمی ادارۂ موسمیات

وہ ضابطۂ قانون ، جو بین الاقوامی انجمن موسمیات کو وجود میں لایا ، بین الاقوامی موسمیاتی اداروں کے ڈائرکٹروں کی بارھویں کانفرنس میں منظور ھوا تھا ۔ اس کا اجلاس واشنگٹن کے مقام پر ۱۹۴۷ء میں منعقد ھوا تھا ۔ وہ ضابطہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۱ء سے برقرار ھے ۔ موسمیات سے متعلق دوسرے طبقاتی مشاھدات کے مرکزوں کا ایک سلسلہ قائم کرنے کے لیے عالمگیر تعاون کی سہولتیں پیدا کرنا اور موسمیاتی معلومات کی فراھمی کے لیے مرکزوں کے قیام و بقا کو ترقی دینا اس کے مقاصد میں شامل ھے ۔ علاوہ ازیں ایک ایسے نظام کے قیام و بقا کو ترقی دینا جس کے بموجب موسمی اطلاعات کا تبادلہ ھوسکے ، موسمی مشاھدات کا تبادلہ ھوسکے ، موسمی مشاھدات کی معیار بندی کو رواج دینا ، نیز مشاھدات اور اعداد و شمار کی باقاعدہ اشاعت کا اھتمام کرنا، پرواز ، جہاز رانی ، زراعت اور زندگی کی دوسری سرگرمیوں میں

موسمیات کے استعمال کو رائج کرنا ، موسمیات سے متعلق تحقیق و تربیت کے کاموں کی ہمت افزائی کرنا اور اس تحقیق و تربیت کو بین الاقوامی طور پر مربوط رکھنے میں مدد دینا بھی شامل ہے ۔

یہ ادارہ موسمی اطلاعات کے بین الاقوامی تبادلے کا اہتمام کرتا ہے اور ممبر ملکوں کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ موسمیاتی خدمات کا سلسلہ قائم کرسکیں یا وہ اپنی اقتصادی ترقی کے منصوبوں میں علم موسمیات و آبیات کے استعمال کو بہتر بنائیں یا وسیع کرسکیں ۔ اس نے ایک عالمگیر موسمیاتی نگرانی کا محکمہ قائم کرنے کی سفارش کی جو موسمیاتی مصنوعی سیاروں پر مبنی ہو ۔ نیز عالمی اور علاقائی مرکزوں کا نظام قائم ہوسکے ۔ اس کے علاوہ اس نے بیرونی فضا میں رونما ہونے والی ترقیوں کی روشنی میں موسمیاتی تحقیقات کے ایک بین الاقوامی پروگرام کی تحریک پیش کی ۔

اس کی ایک عالمگیر موسمیاتی کنگرس ہے جس میں تمام ممبر ملکوں کے موسمیاتی اداروں کے سربراہوں کو نمائندگی حاصل ہے ۔ کم سے کم ہر چار سال بعد اس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے ۔ اس میں موسمیاتی دستور اور طریق کار سے متعلق فنی ضوابط منظور کیے جاتے ہیں اور عام اصول مرتب ہوتے ہیں ۔ اس کی ایک مجلس عاملہ ہے جس کے اراکین کی تعداد اکیس ہے ۔ اس میں موسمیاتی دستور اور طریق کار سے متعلق فنی ضوابط منظور کیے جاتے ہیں اور عام اصول مرتب ہوتے ہیں ۔ یہ کنگرس کی منظور شدہ تجویزوں اور قاعدوں کی تعمیل کا خیال رکھتی ہے ۔ متعلقہ مطالعوں کے لیے پہلا قدم اٹھاتی ہے اور ایسے معاملات کے متعلق سفارش کرتی ہے جن کے لیے بین الاقوامی اقدامات کی

ضرورت ہو ۔ وہ ادارے کے ممبر ملکوں کے لیے فنی معلومات ، مشورے اور امداد مہیا کرتی ہے ۔ اس کا اجلاس سال میں کم سے کم ایک مرتبہ ضرور ہوتا ہے ۔ اس کے تحت چھے علاقائی موسمیاتی انجمنیں ہیں جو الگ الگ افریقہ، ایشیا، جنوبی امریکا، شمالی اور وسطی امریکا ، یورپ اور جنوب مغربی بحرالکاہل سے متعلق ہیں ۔

## محصول اور تجارت کا عام معاہدہ

جب اقتصادی معاملات سے نمٹنے کے لیے مخصوص ادارے قائم کرنے کے منصوبے تیار کیے جارہے تھے تو بین الاقوامی تجارت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ، کیونکہ ۱۹۳۰ء کے بعد کی تجارتی مشکلات کی یاد ابھی تازہ تھی اور اس بات کا پورا احساس تھا کہ تجارت میں پھر تباہ کن طریقے رائج نہ ہوجائیں ۔ مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی تجارت کے متعلق مخصوص ادارہ جب قائم ہوجائیگا تو عالمی تجارت کے فروغ میں مدد ملیگی اور اس طرح معیار زندگی بلند ہوجائیگا ۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی تجارتی ادارے کا چارٹر ۱۹۴۸ء میں مرتب کرلیا گیا ، لیکن اس چارٹر کو جو ہوانا چارٹر کے نام سے موسوم کیا گیا تھا ایک طرف ڈال دیا گیا ، کیونکہ یہ واضح ہوگیا تھا کہ اہم تجارتی ممالک اس کی توثیق نہیں کرینگے ۔ اس عرصے میں ایک بین الاقوامی کثیرالاطرف معاہدے سے کافی کامیابی ہوگئی ۔ اس معاہدے کی تحریک ۱۹۴۷ء میں ان حکومتوں نے چلائی تھی جو اس وقت تجارتی ادارے کے لیے چارٹر کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف تھیں ۔ یہ معاہدہ عرف عام میں ”محصول اور تجارت کا عام معاہدہ“ کہلاتا ہے اور اس کو مختصراً ”گیٹ“ کہتے ہیں ۔ یہ یکم

جنوری ۱۹۴۸ء سے نافذ ہے ۔ وہ بین الاقوامی تجارت کا نظام قائم کرنے کے لیے ایک عام ضابطہ ہے ۔ اس نے محصول تجارت کم کرنے اور اس میں استواری پیدا کرنے کے لیے ایک طریق کار معین کیا ہے ۔ اس کے تحت تجارتی مسائل پر باقاعدہ مشورے بھی کیے جاسکتے ہیں ۔ بحری محصولات میں کمی محصولات کے کثیرالاطرف مذاکرات کے ذریعہ سے ممکن ہوجاتی ہے ۔ اس کے بعد محصولات کی جو شرح مقرر ہوتی ہے ، اس کی پابندی جملہ اراکین کو کرنی پڑتی ہے ۔ اس میں عموماً اضافہ نہیں کیا جاتا جب تک کہ سب اراکین رضامند نہ ہوجائیں ۔ اس اقرار نامے کا ضمیمہ بھی ہے جو اس کا لازمی جزو ہے ۔ درآمد پر مقدار کے اعتبار سے پابندی لگانے کو اصولی طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے ، لیکن اس میں بعض باتیں مثنیٰ بھی کردی گئی ہیں ۔ مثلاً توازن ادائی کی دشواریوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے ۔

" گیٹ ،، کے قاعدوں میں بڑی لچک ہے ۔ اراکین کو عارضی طور پر یہ اجازت دیدی جاتی ہے کہ وہ عام اصولوں سے کسی قدر انحراف چاہیں تو کرلیں ۔ گویا ایک ایسا نظام قائم کرلیا گیا ہے جس میں بین الاقوامی مشوروں کے ساتھ ساتھ شکایات دور کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔ بالفاظ دیگر فیصلے اور سفارشیں کرنے والی ایک جماعت دائرۂ وجود میں آگئی ہے ۔ چنانچہ فریق ملکوں کے باقاعدہ اجلاس ہوتے رہتے ہیں جہاں تجارتی پالیسیوں کے بہت سے پہلوؤں پر تبادل خیالات کیا جاتا ہے ۔

۱۹۵۸ء کے بعد سے " گیٹ ،، نے زیادہ تر ترقی پذیر ملکوں کی تجارتی ضروریات پر توجہ مبذول کی ہے تاکہ ان کی برآمدی آمدنی میں اضافہ ہو اور برآمدات میں جو رکاوٹیں ہوں ، ان

کو کم یا ختم کردیا جائے ۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۶۳ء میں مخصوص پروگرام مرتب کیے گئے اور ۱۹۶۶ء میں ایسے اراکین کی تجارت اور ترقی کو ملحوظ رکھ کر گیٹ کے قاعدوں میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ۔ اس کے ساتھ ھی گیٹ کے سکریٹریٹ میں بین الاقوامی تجارت کا مرکز قائم کیا گیا تاکہ ترقی پذیر ملکوں کو برآمدی منڈیاں اور اشیا کی فروخت کے لیے معلومات فراہم کی جاسکیں ۔ برآمدی تجارت کو فروغ دینے کے لیے خاص طریقے استعمال کرنے میں مدد دی جاسکے اور ان پر عمل درآمد کے لیے ضروری عملے کو تربیت دی جاسکے ۔

## غیر سرکاری ادارے

جنیوا بہت سے غیر سرکاری بین الاقوامی اداروں کا بھی صدر مقام ھے ۔ ان کی تعداد کم و بیش پانچ درجن ھے ۔

جنیوا میں جن بین الاقوامی اداروں کے صدر دفاتر یا شاخیں ھیں ، ان میں کام کرنے والوں کی تعدا نو ھزار کے قریب ھے ۔ یہ اور ان کے بال بچے ملا کر سب کی تعداد تیس ھزار ھوجاتی ھے جو کہ سوئزر لینڈ کے ایک اوسط درجے کے قصبے کی آبادی کے برابر ھے ۔ ان سب کے لیے جنیوا میں تمام روزمرہ کی ضروریات زندگی کا اھتمام کرنا پڑتا ھے ، حالانکہ وہ حکومت کو کوئی ٹیکس ادا نہیں کرتے ۔

ان افراد کے علاوہ اس شہر میں سیاحوں کا سلسلہ جاری رھتا ھے جس کے باعث ھوٹلوں میں عموماً تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی ۔ اسی لیے نئے ھوٹلوں کی تعمیر کا سلسلہ ھمیشہ قائم رھتا ھے ۔ اگر میری حیثیت ایک مندوب کی ھوتی تو شاید میرے قیام میں بھی بڑی دقت ھوتی ۔ میں کوئی انتظام کرلیتا ، لیکن بچیوں کے لیے دقت ھوتی ۔



مجلسِ اقوام کی پہلی جنرل اسمبلی جنیوا میں منعقد ہوئی۔

## دوسرے دفاتر اور ادارے

جیسا کہ میں نے لکھا ہے، قصر اقوام کی عمارت میں اقوام متحدہ کے بعض اور دفاتر بھی قائم ہیں جو براہ راست اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ کے ماتحت ہیں۔ مثلاً مستقل مرکزی افیون بورڈ جسے ۱۹۲۸ء میں انجمن اقوام کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ وہ بین الاقوامی پیمانے پر ان فیصلوں کی نگرانی کرتا ہے جو نشہ آور ادویہ کے سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ جنیوا میں اس بورڈ کی تجربہ گاہیں قائم ہیں۔ وہاں مختلف ملکوں سے افیون کے نمونے لائے جاتے اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ جو افیون ناجائز تجارتی حمل و نقل میں پکڑی گئی ہے، وہ کس ملک میں تیار ہوئی تھی، کیونکہ ہر ایک کی تیاری کا طریقہ جداگانہ ہے۔

جنیوا میں اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ کی جو شاخیں قائم ہیں، ان میں اقتصادی کمیشن برائے یورپ بھی ہے۔ اس کا تعلق صرف یورپ کے اقتصادی اور فنی تعاون سے ہے۔ ایسے ہی اقتصادی کمیشن ایشیا اور مشرق بعید اور لاطینی امریکا کے لیے بھی قائم ہیں۔ اقتصادی کمیشن برائے یورپ کی فنی شاخیں بجلی، گیس، کوئلے، فولاد اور لکڑی کی تقسیم کے معاملے پر غور کرتی ہیں اور اس کے ساتھ زراعت، صنعت، مکانات کی تعمیر اور حمل و نقل کے وسائل کے جملہ پہلو بھی مد نظر رکھے جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے کمشنر برائے پناہ گزیں کا دفتر بھی جنیوا میں ہے۔ اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ مختلف ملکوں کے پناہ گزینوں کو جو دوسرے علاقوں میں عارضی طور پر آباد ہوگئے ہین، اپنے دائرۂ عمل میں لاکر انہیں قانونی تحفظ دلوایا جائے اور مستقل آبادکاری کے خیال سے ان کے لیے نئے وطن تلاش

کیے جائیں ۔

ترقی پذیر ملکوں کو فنی امداد دینے کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے نیو یارک میں قائم ھیں ، لیکن زیادہ اھم اور قدیم ادارہ جو ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸٦ء کے درمیان وجود میں آیا تھا ، '' متحد بین الاقوامی دفتر برائے تحفظ صنعتی ، ادبی اور فنی املاک ،، کہلاتا ھے ۔ یہ قصر اقوام میں نہیں ھے ، بلکہ اسکے قریب ھی جدید طرز کی ایک عمارت میں ھے ۔ اسی طرح بین الاقوامی دفتر تعلیم جو ۱۹۲۵ء میں قائم ھوا ، قصر ولسن میں ھے ۔ یہ تعلیم کے میدان میں معلومات اور تحقیقات کے مرکز کی حیثیت سے کام کرتا ھے ۔ اسی کے زیر اہتمام اقوام متحدہ کے تعلیمی ، سائنسی اور ثقافتی ادارے ( یونیسکو ) کا ایک اجلاس جنیوا میں ھوتا ھے ۔ حالانکہ اصل ادارہ پیرس میں قائم ھے ۔ ۱۹۲۷ء سے فرسٹ ایڈ کی بین الاقوامی انجمن کا دفتر بھی جنیوا میں قائم ھے ۔ اس کا بنیادی کام یہ ھے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی مصیبت یا تباھی زلزلے ، سیلاب یا وبائی امراض کی صورت میں اچانک نمودار ھو تو وھاں کی متاثرہ آبادی کے لیے ابتدائی طبی امداد فراھم کی جائے ۔

۱۹۵۱ء میں ایک بین الحکومتی کمیٹی برائے یورپی نقل سکونت قائم ھوئی ۔ یہ ان لوگوں کے سفر کے انتظامات میں مدد دیتی ھے جو کسی خاص وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ھوجانا چاھتے ھیں ۔ ۱۹٦۹ء میں یورپی آزاد تجارت کی انجمن کا سکریٹریٹ بھی جنیوا کی اس عمارت میں قائم کرلیا گیا جو '' متحد بین الاقوامی دفتر برائے صنعتی ، ادبی اور فنی املاک ،، کے لیے مخصوص ھے ۔

مذکورہ بالا تمام اداروں کی سرگرمیوں کے پیش نظر یہ

کہنا آسان ہے کہ ان کے ماہانہ ، سہ ماہی ، ششماہی یا سالانہ جلسوں میں شرکت کے لیے مختلف ملکوں کے ہزاروں مندوبین ، مبصرین ، مشیر ، عام اراکین اور صحافی برابر آتے جاتے رہتے ہیں ، جن کی چہل پہل یہاں کی سماجی زندگی پر گہرا اثر ڈالتی ہے ۔ ان سب کے قیام و طعام کے لیے قدرتی طور پر بہت سے ہوٹل قائم ہیں اور آئے دن کھلتے رہتے ہیں ۔ ان میں سکونتی سہولتوں کے علاوہ مختلف النوع کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے ذوق کے مطابق کام و دہن کی لذت میسر آسکے ۔

## غیر جانب داریت کی پالیسی

مختلف النوع بین الاقوامی اداروں کے قیام کا یہ نتیجہ نکلا کہ رفتہ رفتہ ملک کو اپنی انسانیت نواز ذمہ داریوں کا اور قوموں کے درمیان اپنے غیر جانبدارانہ رشتے کا احساس ہوتا گیا ۔ حکومت وقت یہ نہیں چاہتی کہ اس کی غیر جانبداریت ایک مجہول اور بے کیف بار بن جائے ۔ اس کے برعکس اس نے چاہا کہ یہ ایک ایسے مقدس مقام کا اثاثہ بنے جو کہ جنگ آزما قوتوں کو اپنی مصالحتی خدمات پیش کرسکے ۔ یہ ایک ایسی جگہ بن جائے کہ جہاں بین الاقوامی ادارے اور تحقیقاتی تنظیمیں بلا روک ٹوک موثر انداز میں کام کرسکیں ۔ دو عالمگیر لڑائیوں کے دوران ، جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک اور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک دنیا بھر میں تباہی پھیلاتی رہیں ، سوئزر لینڈ پناہ گزینوں اور جنگی زخمیوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن گیا تھا ۔ حالانکہ یہ قابل تعریف سرگرمیاں کبھی کبھی انسانی کوتاہیوں اور بے پروائیوں کی وجہ سے داغدار بھی ہوگئیں ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سوئزر لینڈ تقریباً پونے دو سو سال

تک بین الاقوامی معاملات میں قطعی طور پر غیر جانبدار رہا ۔ پہلی بار ۱۸۱۵ء کے موسم خزاں میں جو امن کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی ، اس میں یورپ کی بڑی طاقتوں نے سوئزر لینڈ کی غیر جانبداری کو تسلیم کرلیا تھا ۔ پہلی عالمگیر لڑائی ختم ہونے کے بعد ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو معاہدہ وار سیلز کی دفعہ ۴۲۵ کے تحت اس غیر جانبداری کی تجدید ہوئی ۔ بین الاقوامی قانون میں اس غیر جانبداری کی ایک اور بنیاد ۱۴ مئی ۱۹۳۸ء کو انجمن اقوام کے اس اعلان کے ساتھ پڑی جس میں اس ملک کو اس کی غیر جانبدارانہ پالیسی کے تحت یہ حق دیا گیا کہ وہ مذکورہ انجمن کے اقدامات میں شریک نہ ہو ۔

غیر جانبداری کا یہ حق اس کارروائی کا نتیجہ ہے جس کا نشو و نما صدیوں میں ہوتا ہے ۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسکی ترقی رواجی قانون سے ہوتی ہے اور آج بھی جزوی طور پر اس کی بنیاد رواجی قانون ہی پر قائم ہے ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ بات غیر جانبداریت کے ساتھ روا اور جائز تھی کہ غیر جانبدار ملک لڑاکا ملکوں کی فوجوں کو اپنے علاقے سے گزرنے دیں ۔ غیر جاندار ملک لڑاکا قوموں کو سپاھی اور جنگی سامان بھی فراھم کرسکتے ھیں ، لیکن اسی صدی کے آخر میں غیر جانبداریت کے جدید نظریات کی ابتدا ہوئی ۔ یہ شرط عائد کی گئی کہ غیر جانبدار ملک ھر لحاظ سے جنگی کارروائیوں سے اپنے آپ کو علاحدہ رکھیں اور لڑنے والوں کو کسی قسم کی امداد نہ دیں ۔ ان نئے اصولوں کو قبول کرنے میں کافی عرصہ لگا ، بلکہ بعض موقعوں پر ان کے خلاف عمل کیا گیا ۔

۱۸۶۳ء میں جب پولینڈ کے باشندے زار روس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو غیر جانبدار سوئزر لینڈ نے اپنے عقیدہ حریت

پسندی کی بنا پر پولینڈ کی حمایت کی ۔ اس نے کپڑے ، دوائیں اور مالی امداد ہی نہیں دی بلکہ ہتھیار بھی فراہم کیے ۔ نیز اس ملک کے بہت سے رضا کار میدان جنگ کی طرف چل پڑے ۔ روس کے احتجاج کے باوجود یہ سلسلہ بند نہ ہوا ۔ اس صدی کے اختتام پر غیر جانبدریت کا تصور محدود معنوں میں تسلیم کیا گیا ۔ پھر ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں منعقد ہونے والی امن کانفرنس میں غیر جانبداریت کے حق کی نئے انداز میں وضاحت کی گئی جو آج بھی تسلیم کی جاتی ہے ، سوائے اس کے کہ ۱۹۴۹ء کے جنیوا کنونیشن کے تحت کچھ ترمیم ہوئی ۔ مختصراً یہ کہ غیرجانبداریت کے اصولوں کا اطلاق انسان دوستی پر کیا گیا ۔ اس کے بموجب جنگ کرنے والے اور غیر جانبدار ممالک کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں کچھ حقوق اور ذمہ داریوں کو شامل کیا گیا ۔ اس کے بموجب غیر جانبدار ملک کو جنگ سے بالکل الگ تھلگ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ نہ صرف ہتھیار اور گولہ بارود کی فراہمی ممنوع قرار پائی بلکہ مالی امداد اور جنگی قرضوں کی ممانعت بھی کردی گئی ۔ تاہم غیرجانبدار ملک کو اپنے علاقے محفوظ رکھنے کا حق دیا گیا ۔ جو پابندیاں عائد کی گئیں وہ حکومتوں کے لیے تھیں ۔ افراد کو کھلی آزادی تھی کہ اگر وہ کسی جنگجو قوم کو کوئی سامان حرب دینا چاہیں تو ان کو منع نہیں کیا جاسکتا ۔

ان عام اصولوں سے قطع نظر سوئزر لینڈ نے باضابطہ طور پر اپنی مکمل غیر جانبداریت کا اعلان کردیا ۔ یعنی وہ یا اس کے باشندے کسی بھی اعتبار سے لڑاکا فوجوں کے ساتھ معاون یا ملوث نہیں ہونگے ۔ البتہ زمانۂ جنگ میں یا جنگ کے بعد زخمی، معذور یا اپاہج سپاہیوں یا متعلقہ افراد کی طبی یا مالی مدد کی جاسکیگی ۔ حتیٰ کہ وہ انسان دوستی کے جذبے کے تحت دوسرے

امن پسند ملکوں سے بھی اس ضمن میں اعانت طلب کرسکیگا ۔ اس کے نزدیک یہ جذبہ اور اس کا عملی پہلو انسان کو فضائے امن و عافیت کی طرف لے جاتا ہے ۔

## اقوام متحدہ کے یورپی دفتر میں

مختلف عالمی دفاتر کی سیر سے فارغ ہوکر ہم بالآخر اقوام متحدہ کے یورپی دفتر کی عمارت میں ، جو اسی قصراقوام میں واقع ہے ، پیدل پہنچ گئے ۔ دروازہ نمبر ۴۰ اور کمرہ نمبر ۱۷ تک جانے میں زیادہ دقت نہ ہوئی ۔ جناب جسٹس بشیر احمد مرحوم کے بھانجے یہاں مل گئے ۔ ان سے لاہور میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں ۔ وہ اس ادارے میں کام کرتے ہیں ۔ ان کے تعاون سے ہمیں یہ دفتر دیکھنے کا موقع ملا ۔ اس وقت انسانی حقوق کے کمیشن کا اجلاس پاکستان کی قابل احترام شخصیت جناب جی الانا صاحب کی صدارت میں ہورہا تھا ۔ ایران کے مندوب نہایت جوش و خروش کے ساتھ مغربی دنیا میں رہنے والوں کی انسانیت سوز حرکات کی پول کھول کر ان کے اخلاق و کردار کی دھجیاں بکھیر رہے تھے ۔ ہندستان کی مندوب مسز آر ، کے ، نہرو والہانہ انداز میں ان کے خیالات کی داد دے رہی تھیں ۔

جلد ہی اجلاس ختم ہوگیا تو ہم الانا صاحب کے کمرے میں آگئے ۔ وہ بہت گرمجوشی سے ملے ۔ اپنے وطن میں ان سے ملاقات کا سلسلہ دیرینہ ہے ۔ وہ نہایت پابندی کے ساتھ ” شام ہمدرد ،، کی تقریبات میں حصہ لیتے اور کبھی کبھی خطاب بھی کرتے ہیں ۔ وہ انسانی حقوق کے کمیشن کے صدر بننے کے مستحق ہیں ، کیونکہ ان میں انسان دوستی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے ۔ انہوں نے اپنے دفتر اور مرکز کے تمام شعبوں کی سیر کرائی اور سرسری جائزہ پیش کیا ۔ انہوں نے اپنے انتظام سے



جینوا کے قصرِ اقوام میں اقوامِ متحدہ کے یورپی دفتر کا ایک کانفرنس روم۔

ہمیں ساڑھے سات بجے ہوٹل پہنچوا دیا ۔

رات کو پاکستان کے مستقل مشن کے خالد سلیم صاحب نے عشائیہ دیا ، جس میں ہم سب کے علاوہ اور بھی حضرات شریک طعام ہوئے ۔ خالد سلیم صاحب کی اہلیہ محترمہ ناھید میری بیٹی سعدیہ کی ہم جماعت رہ چکی ہیں ۔ لہذا وہ دونوں بھی آپس میں مل کر بہت خوش ہوئیں ۔ تجدید تعلقات کو ہمیشہ مسرور کن سمجھا جاتا ہے ۔ بیگم ناھید ڈاکٹر غوری صاحب کی صاحبزادی ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی میرے دیرینہ تعلقات ہیں ۔ کھانے کی اس محفل میں جناب جی الانا صاحب ، جسٹس مشتاق حسین صاحب ، جناب شہید صاحب ، جمشید حمید صاحب وغیرہ احباب سے ملاقات رہی جو اس موقع پر مدعو تھے ۔ بیگم ناھید خالد نے بڑے لذید کھانے تیار کرائے تھے ۔ ہر چیز میں خلوص و انس کی پوری آمیزش تھی ۔

ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل واپس آئے ۔ بچیاں اور خانم ڈی سلوا اپنے کمرے میں جلدی ہی سوگئیں ۔ میں اپنے معمول کے مطابق کچھ دیر دن بھر کے واقعات اور آئندہ کے پروگرام کے بارے میں سوچتا رہا ۔ پھر اپنے آپ کو شب بخیر کہ کر سو گیا ۔

## نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

گزشتہ رات نیند بہت خراب رہی ۔ کوئی دو بجے یعنی سونے کے دو گھنٹے بعد آنکھ کھل گئی ۔ بہت سا وقت بے کیفی کے ساتھ کروٹیں بدلنے میں گزرا ۔ جب انسان کے ذہن پر کوئی غیر معمولی بار ہو ، وہ کسی الجھن میں مبتلا ہو تو پرسکون نیند کیسے آسکتی ہے ۔ بستر پر دراز ہونے سے پہلے مجھے پاس پورٹوں

کا خیال آگیا تھا - کل تین بجے تک ان کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ پاس پورٹ تیار ھیں - ھفتے کو دس بجے تک چاروں مل جائینگے - میرا ، دونوں بچیوں کا اور خانم ڈی سلوا کا - یہ سب جانچ پڑتال کے لیے منگائے گئے تھے ، کیونکہ ھم نے لندن کا ویزا طلب کیا تھا - رات کو جب واپسی ھوئی تو ایک پیغام ملا کہ پاس پورٹ تیار نہیں ھیں - اس سے ذھن الجھا رھا - میں نے ٹیلے فون کے ذریعہ سے برن میں سفارت خانے کے تھرڈ سکریٹری جناب گل صاحب سے بات کی تھی - ان کو صحیح صورت حال کا علم نہیں تھا اور سفارت خانہ آج اور کل بند رھیگا - لہذا مزید معلومات کی توقع بھی نہیں ھوسکتی تھی - اب یہی ممکن تھا کہ پیر کو دس بجے زیورخ سے ٹیلے فون پر ان سے بات کی جائے اور پھر کسی کو بھیج کر سب پاس پورٹ منگوائے جائیں - خانم ڈی سلوا کے صاحبزادے ماسٹر ٹیریس ڈی سلوا یہ کام کرسکتے تھے - میں نے گل صاحب سے کہ دیا تھا کہ آپ دس بجے تک صحیح صورت حالات معلوم کرلیں اور جب میں فون کروں تو مجھے بتادیں - پاس پورٹ ھر حالت میں ملنے ضروری تھے ، کیونکہ منگل کے روز ھمیں لندن جانا تھا - گل صاحب کو جب میں نے فون کیا تو صبح کے ساڑے آٹھ بجے تھے - وہ ذرا مشکل سے بیدار ھوئے - ان کو تکلیف دے کر مجھے بڑی شرم آئی ، مجھے کسی کے پروگرام میں دخل دینے کا اختیار نہیں تھا -

رات کو نیند بے چینی کے ساتھ کروٹیں لیتے گزرے تو جسم کے تمام اعضا مضمحل ھوجاتے ھیں - طبیعت بے چین رھتی ھے - آنکھوں پر بھی برا اثر پڑتا ھے ، خواہ ان پر پٹی کیوں نہ باندھ لی جائے - آنکھوں کی پتلیاں سکون سے نہیں رہ سکتیں - بلاشبہ چوبیس گھنٹے میں کم سے کم چھے گھنٹے تک ان کو

آرام پہنچانا ضروری ہے ، ورنہ بیدار ہونے کے بعد وہ معمول کے مطابق روز مرہ کے کام میں انسان کا پوری طرح ساتھ نہیں دے سکتیں ۔ جب کسی کروٹ نیند نہ آئی تو میں نے مطالعہ شروع کردیا ، حالانکہ جانتا تھا کہ اس طرح آنکھوں پر مزید بار پڑیگا ، لیکن بیکار وقت گزارنا میری عادت کے خلاف ہے ۔ ظاہر ہے کہ سوئزر لینڈ کے سفر کے دوران صرف اسی ملک کے حالات زیر مطالعہ لائے جاسکتے تھے ۔

ایک کتابچے میں عورتوں کی حیثیت سے متعلق ایک مضمون پر نظر پڑگئی اور اسے پڑھنا شروع کردیا ۔ بہت ہی معلومات افزا تھا ۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کچھ عرصے پہلے تک اس ترقی یافتہ ملک میں بھی عورتوں کو خاص حقوق حاصل نہیں تھے ۔

اس موضوع سے میری دل چسپی یوں بھی ہے کہ میں نے ان حقوق و فرائض کا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ جو طلوع اسلام کے بعد عورتوں کو دیے گئے ۔ در حقیقت تاریخ معلوم میں یہ اسلام ہی کو مقام رفعت حاصل ہے کہ اس نے عورت کو کس مپرسی کی زندگی سے نکال کر اسے مقام شرف و عزت دیا ہے اور حق و فرض کو اس طرح واضح اور متعین کردیا کہ توازن فطرت برقرار رہے اور عورت معاشرے کا اہم جز تسلیم کی جائے ۔

مغربی ممالک میں ان دنوں عورت کے حقوق کا بڑا چرچا ہے ، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ مغرب نے توازن کی شان کو کھودیا ہے اور وہاں عورت نے جو روپ دھارا ہے وہ فطرت شکنی کا عکاس ہے اور اس سے معاشرے میں ایسا فساد پیدا ہوگا کہ مغرب بے چین ہوجائیگا ۔ بد قسمتی سے پاکستان کی شہری عورتیں اس مغربی رو میں بہ رہی ہیں اور پاکستان کے صاحبان اقتدار اس

کو پوری طرح ہوا دے رہے ہیں - یہ صورت حال خطرناک حدوں میں داخل ہورہی ہے اور میں اس سے ذہنی طور پر پریشان ہوں اس لیے سوئٹزر لینڈ میں عورت کے حقوق کے بارے میں مطالعہ ضرور وجہ دلچسپی ہے -

۷ جنوری ۱۹۷۱ء سے یہاں کی عورتوں کو وفاقی سطح پر سیاسی حقوق حاصل ہوئے ہیں - اس سے کچھ عرصے پہلے جن ریاستوں میں انہیں رائے دینے کا حق حاصل نہیں تھا ، ان میں سے بیشتر میں اب وہ منتخب بھی کی جاسکتی ہیں - ۱۹۷۲ء کے خاتمے پر تمام بالغ شہریوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت ، رائے دینے کا حق حاصل ہوگیا اور بیس ریاستوں کی وفاقی ریاستی اور برادری کی سطح پر بھی ان کو منتخب کیا جانے لگا - سب سے پہلے گریسنز ، اوب والڈن اور سولوتھرن نامی ریاستوں میں یہ حقوق تفویض کیے گئے - البتہ صوبہ اپن زل کی دو ریاستوں میں یہ حقوق اب تک عورتوں کو نہیں ملے ہیں ، مگر وہ کوشاں ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ان کو بھی محروم نہیں رکھا جائیگا -

بعض ریاستوں میں مختلف اداروں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو عورتوں کو تعلیمی اور مذہبی معاملات میں رائے دینے کا حق دیدیں - تین ریاستوں ، یعنی گلیرس ، اوب والڈن اور نڈ والڈن میں عورتوں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کھلے میدان کے جلسوں میں شرکت کریں ، لیکن ان کے احتجاج پر یہ اجازت مل گئی - اب وہ ایسے جلسوں میں وسیع پیمانے پر شرکت کرتی ہیں -

حقوق حاصل ہونے کے بعد عورتیں سیاسی سرگرمیوں میں بھی شرکت کرنے لگیں - چنانچہ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۵ء کی مدت کے لیے نیشنل کونسل کے جو دو سو اراکین منتخب ہوئے ، ان میں

خواتین کی تعداد بارہ تھی ۔ اس سے بالائی سطح پر اسٹیٹ کونسل کے چوالیس ارا کین میں ایک عورت کو شمولیت کا موقع ملا ۔ ملک کی جملہ ریاستوں میں انتخابات ہوئے تو مجموعی طور پر دو ہزار ایک سو ترپن نشستوں میں سے ایک سو پنتالیس پر عورتیں قابض ہوگئیں ۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ تناسب شہر بازل کی ریاست میں رہا ، جہاں ایک سو تیس نشستوں کے ایوان میں خواتین کی تعداد بیس رہی ۔ سب سے کم تناسب ریاست تھرگاؤ میں تھا ، جہاں ایک سو تیس نشستوں کے ایوان میں ان کی تعداد صرف ایک تھی ۔ تاہم یہاں عورتوں کو سیاسی حقوق سب سے آخر میں ملے تھے ۔

برن ، جنیوا اور زیورخ میں بہت سی عورتوں کو سرکاری انتظامی عہدے مل گئے۔ ایک خاتون کو ملک کی سپریم عدالت میں جج مقرر کیا گیا ۔ یہ اس ضمن کی پہلی مثال ہے ۔ اب ریاستی اور قصباتی عدالتوں میں ان کو بڑی تعداد میں مواقع مل رہے ہیں ۔ ان میں یہ شعور پیدا ہوگیا ہے کہ اعلا عہدے حاصل کرنے کے لیے اعلا تعلیم حاصل کی جائے۔ حق رائےدہی ملنے کے بعد انہیں مدنی ، خاندانی ، سماجی اور اقتصادی قوانین کو سمجھنے کا شوق ہوا اور باقاعدہ تعلیم کے بعد وہ اس منزل میں آگے بڑھنے لگیں ۔ تاہم ابھی ان کی تعداد بہت کم ہے ۔

ایک لحاظ سے اب بھی عورتوں اور مردوں کے درمیان زبردست فرق موجود ہے ۔ اگر ایک غیر ملکی عورت سوئزر لینڈ کے کسی مرد سے شادی کرلیتی ہے تو اسے شادی کے فوراً بعد شہری حقوق حاصل ہوجاتے ہیں اور جب بچے پیدا ہوں تو ان کو قدرتی طور پر باپ کی قومیت مل جاتی ہے ۔ اس کے برعکس اگر سوئزر لینڈ کی عورت کسی غیر ملکی مرد سے شادی کرلے اور

وہ بیوی کے ساتھ اسی کے ملک میں رہنا چاہے تو اسے مستقل سکونت کا اجازت نامہ بھی نہیں ملیگا اور نہ اس کی اولاد کو شہری حقوق ملینگے ، خواہ وہ بچے سوئزرلینڈ ھی میں پیدا ھوں ، ان کو غیر ملکی سمجھا جائیگا ۔ البتہ مسلسل دس سال تک ملک میں رہنے پر ان کو مستقل سکونت کا اختیار مل سکیگا ۔ خواتین کی انجمنیں اس ضمن میں کوشاں ھیں کہ قانون میں لچک پیدا کرالیں اور کم سے کم سوئس عورت کے بچوں کو پیدائش کے وقت ھی سے قومی حقوق مل جایا کریں ۔ اسی طرح غیر ملکی مرد کو بھی سوئس بیوی کے ساتھ کچھ عرصے ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد حقوق مل جانے چاھئیں ۔

ازدواجی زندگی سے متعلق ایک قانون کو بدلنے کی کوشش کی جارھی ھے جو کہ ۱۹۱۱ء سے جوں کا توں قائم ھے ۔ اس کی رو سے مرد خاندان کا سربراہ ھوتا ھے ۔ یہ اس کا فرض ھے کہ بیوی بچوں کی کفالت کرے ۔ ان کی تمام ضروریات زندگی کو پورا کرے ۔ اگر بیوی کی اپنی کوئی جائداد ھو تو اس کا انتظام بھی کرے اور اگر ضرورت ھو تو اسے فروخت کردے ۔ اس ضمن میں بیوی کو اعتراض کا حق نہیں ھوگا ۔ اس قانون کو بدلنے کے لیے بڑے پیمانے پر جدوجہد ھورھی ھے ۔ اگر عورت اپنے شوھر کی اجازت سے ، جو ھر حال میں ضروری ھے ، کسی کمپنی ، ادارے یا دفتر میں ملازمت کرلیتی ھے تو اس کی تنخواہ یا معاوضہ پر شوھر کو اختیار حاصل ھوگا کہ وہ جس مقصد کے لیے چاھے خرچ کرلے ۔

عائلی قوانین میں کچھ اور بھی تبدیلیاں ھوئی ھیں ۔ مثلاً گود لینے کے قانون پر یکم اپریل ۱۹۷۳ء سے عمل شروع ھوا ھے ۔ جائز اور نا جائز بچوں کے درمیان جو امتیاز برتا جاتا تھا ،

وہ بھی بتدریج ختم کیا جارہا ہے ۔ اس ضمن میں قوانین کا مسودہ ، جو عارضی طور پر منظور کرلیا گیا ہے ، توثیق کے لیے پارلیمان میں پیش کردیا جائیگا ۔

اسقاط حمل سے متعلق قانون میں بھی تبدیلی تجویز کی گئی ہے ۔ فی الحال اسقاط کی اجازت صرف اس وقت ملتی ہے کہ جب زچہ کی موت یا کسی مستقل روگ کا اندیشہ لاحق ہو ۔ خواتین کی انجمن کوشش کر رہی ہے کہ اسقاط کے لیے پوری آزادی مل جانی چاہیئے ۔ یہ مناسب ہے یا نہیں ، یہ ایک علاحدہ موضوع ہے ، مگر یہ فراموش نہ کیا جائے کہ سوئزر لینڈ یورپ میں ہے !

بہت سی منزلوں میں خواتین کو آزادی اور اختیار مل جانے کے باوجود بیشتر عورتیں اپنا زیادہ وقت گھر اور بچوں کی دیکھ بھال میں گزارتی ہیں ۔ بہت سے خاندان اپنی لڑکیوں کو پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت دلانے کے خلاف ہیں ۔ ان کا نظریہ ہے کہ عورت کو گھر کی چار دیواری میں رہ کر صرف وہ کام کرنے چاہئیں جو اسے زیب دیتے ہیں ، تاکہ عائلی زندگی خوشگوار ہوسکے ۔

صنعتی قانون کے میدان میں کافی پیش رفت ہوئی ہے ۔ ملازمت کے سلسلے میں جو نیا قانون یکم جنوری ۱۹۷۲ء سے نافذ العمل ہوا ہے ، اس کی رو سے عورتوں کو حمل کے دوران میں اور زچگی کے بعد مجموعی طور پر چالیس دن کی رخصت تنخواہ سمیت ملنے لگی ہے ۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء سے سوئزر لینڈ نے ایک بین الاقوامی معاہدے کی توثیق بھی کردی ہے جس کی رو سے مردوں اور عورتوں کو یکساں کام کے عوض مساوی تنخواہ ملنے لگی ہے ۔ پہلے عورتوں کو نسبتاً بہت کم معاوضہ ملتا تھا ۔

انتظامیہ میں عہدوں کے اعتبار سے بھی ان کے فرق کو دور کردیا گیا ہے ۔ عورتیں ہر عہدے پر ترقی پاسکتی ہیں ۔ پہلے کم تنخواہ کی وجہ سے ان کو کم حیثیت کے عہدے دیے جاتے تھے۔ نجی اداروں میں ہنوز امتیاز برتا جاتا ہے جسے دور کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ بعض ادارے عورتوں کو ملازم رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کہ انہیں زچگی کی رخصت تنخواہ سمیت دینی پڑیگی ۔ میں نے یہ نوٹ کیا کہ اس رویہ کے خلاف احتجاج ہورہا ہے ۔

یکم جنوری ۱۹۷۳ء سے شادی شدہ عورتوں کو یہ حق مل گیا ہے کہ وہ کسی کمپنی یا دفتر سے سبکدوش ہوتے وقت اپنی پنشن کی آدھی رقم فوراً وصول کرلیں تا کہ اس سے کوئی جائداد وغیرہ خرید کر اپنا مستقبل سنوار سکیں ۔ پہلے یہ حق صرف مردوں کو حاصل تھا ۔ اب اگر سبکدوش ہونے والی عورت کا شوہر خوشحال ہو ، برسرکار ہو یا اس کی آمدنی معقول ہو ، تب بھی عورت کو پنشن کی آدھی رقم ملجاتی ہے ۔

طلاق شدہ عورتوں کی حیثیت بھی بہتر کردی گئی ہے ۔ اگر بیوہ یا مطلقہ دوبارہ شادی کرلے تو اس کی پنشن پر کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ سوتیلے یا گود لیے ہوئے بچوں کی صورت میں بھی عورتوں کو زیادہ حقوق مل گئے ہیں ۔ ان کو "بے ماں کے بچوں" کی پنشن ملنے لگی ہے ۔

خاندانی ٹیکس پر نظرثانی کی جارہی ہے ۔ ٹیکس کے ضمن میں شوہر اور بیوی کو اکائی سمجھا جاتا ہے ۔ یعنی ان کی آمدنی اور جائداد کا ایک ساتھ جائزہ لیکر ٹیکس کی رقم محسوب کی جاتی ہے ۔ یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ شادی شدہ جوڑے کی آمدنی سے نہ صرف دو انسانوں بلکہ ان کے بچوں کی بھی پرورش ہوتی ہے ۔ اور وہ بچے کوئی روزی نہیں کماتے بلکہ

ان کے اخراجات والدین کو برداشت کرنے پڑتے ھیں - چنانچه ٹیکس عائد کرتے وقت بچوں کی تعداد کو ملحوظ رکھا جاتا ھے -

## حدیقهٔ نباتات

سعدیه ، فاخره اور خانم ڈی سلوا کے بیدار ھوجانے کی وجه سے مجھے مطالعه ترک کردینا پڑا - اب دوسرے مشاغل اور ذمه داریوں کا زور شروع ھوگیا - میں نے جب پروھیلویتیا کو اپنا پروگرام بنانے کو کہا تھا تو اس میں حدیقهٔ نباتات دیکھنے کی گنجائش رکھوائی تھی - چنانچه غسل وغیره سے فارغ ھونے اور ناشته کرلینے کے بعد صبح دس بجے سے ایک بجے تک ھم نے باغ نباتات میں وقت صرف کیا -

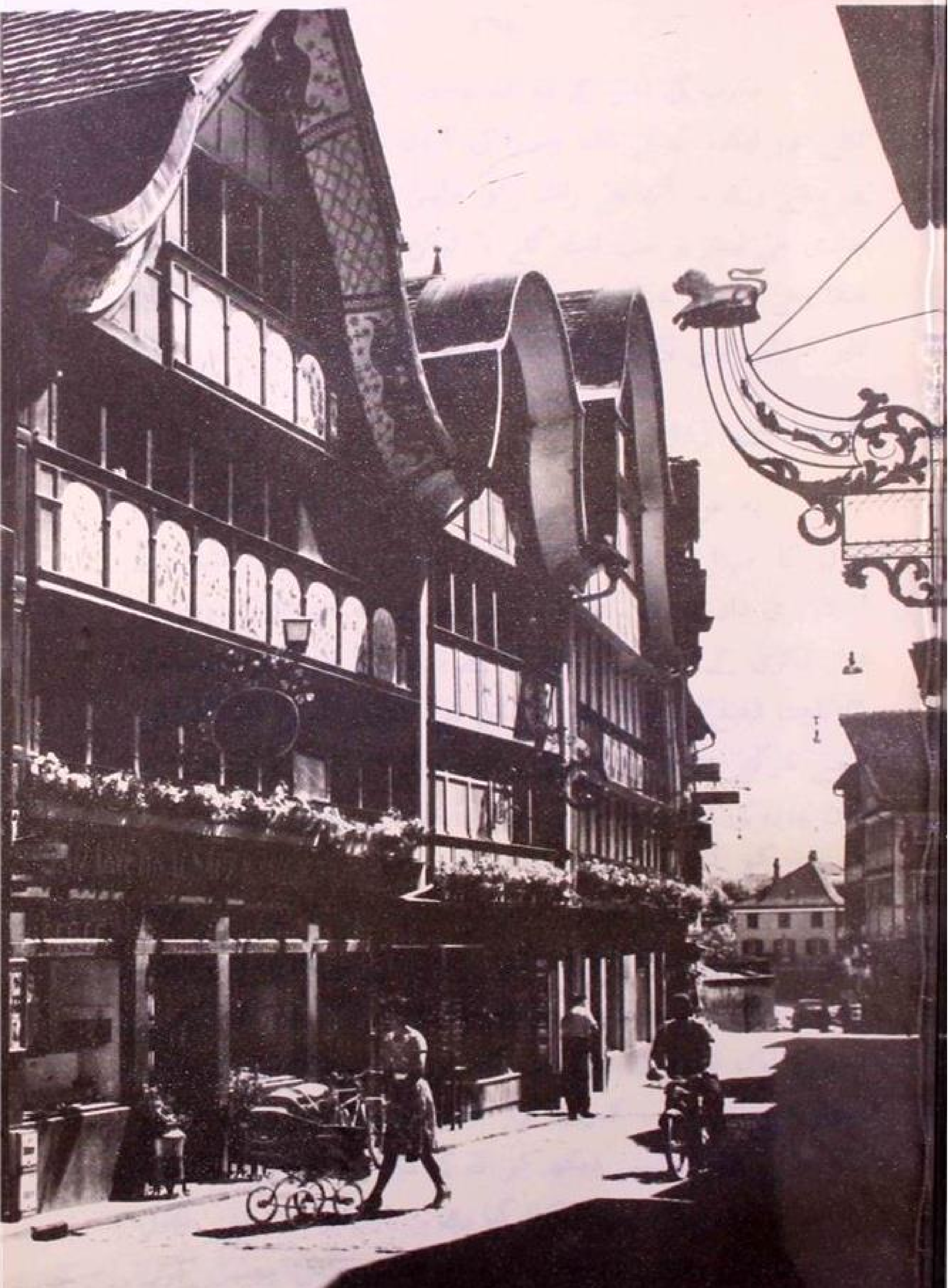
یه بہت بڑا باغ ھے - اندازاً تیس ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ھوا ھے - اس باغ میں ایک کتب خانهٔ نباتات بھی ھے جسے عالمی اھمیت حاصل ھے - میں نے پہلی بار اسے ١٩٥٦ء میں دیکھا تھا - اب وہ ایک نئی عمارت میں منتقل ھوگیا ھے - اس کتب خانے میں صرف نباتات کے موضوع پر تقریباً ایک لاکھ کتابیں ھیں جو تین زبانوں میں ھیں - یہاں نباتات کے موضوع پر رسائل و اخبارات بھی آتے ھیں ، جن کی تعداد بہت زیادہ ھے - یہاں نباتات کے نمونے بھی رکھے گئے ھیں جن کی باقاعده حفاظت کی جاتی ھے - ایک زیر زمین ته خانه ھے جو ایٹم بم پروف ھے - یعنی باھر کتنی ھی بم باری ھو ، ایٹم بم تک گرادیا جائے ، وہ محفوظ رھیگا - اس ته خانے میں نباتات کے خشک نمونے اوراق پر چسپاں ھیں جو ھمیشه محفوظ رہ سکینگے -

اس باغ کو دیکھنے کا خاص مقصد یه تھا که میں خود بھی اپنے وطن میں ایک "شہر ثقافت" قائم کرنا چاھتا ھوں - اس میں ایک باغ نباتات بھی ھوگا - میرا اندازہ ھے که صرف باغ

نباتات کی تکمیل کے لیے پچیس تیس ایکڑ زمین درکار ہوگی ۔ اس میں مرکزی لائبریری بھی ہوگی ۔ یہ کام میری نگرانی میں ہوگا ۔ اگر مجموعی طور پر کسی جگہ کراچی میں ایک سو ایکڑ زمین مل گئی تو کام بہت خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوگا ۔ انڈیا میں میرے محترم برادر بزرگ حکیم عبدالحمید صاحب نے تغلق آباد کے قریب ایک نہایت طویل و عریض قطعۂ اراضی پر باغ نباتات قائم کر رکھا ہے ۔ آخر پاکستان اس نعمت سے کیوں محروم رہے ۔ تاہم مجھے توقع نہیں ہے کہ حکومت سندھ اس ضمن میں میری کوئی مدد کرسکیگی ۔ مجھے وفاقی حکومت کی سطح پر کوشش کرنی ہوگی ۔

میں نے واپس آکر اپنی سکریٹری خانم ایل ۔ اے ۔ ڈی سلوا کو ذمہ داریاں سونپ دیں ۔ انہیں ہدایت کردی کہ اس سفر کے دوران جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ کسی عنوان ہمارے کام آئے ہیں ، ان کو شکریے کے خطوط لکھ ڈالے جائیں ۔ اب سوئزر لینڈ میں ہمارا قیام ختم ہونے کے قریب ہے ۔ تمام خطوط تیار ہوگئے تو لندن پہنچنے سے پہلے انہیں کراچی بھیج دیا جائیگا ، تاکہ ہماری عدم موجودگی میں وہ تیار ہوتے رہیں اور جب ہم وہاں پہنچیں تو انہیں روانہ کردیا جائے ۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگی اور کراچی پہنچنے پر دوسری مصروفیات لاحق ہو جائینگی ۔ اس لیے یہ کام اس وقت ممکن نہیں ہوسکیگا یا دشوار ضرور ہوگا ۔

ہوٹل پہنچ کر سب نے کھانا کھایا ۔ میں نے حسب معمول دودھ اور ڈبل روٹی پر اکتفا کیا ۔ بچیوں کو آرام کرنے کے لیے کہا اور میں اپنی عادت کے مطابق مطالعے میں مشغول ہوگیا ۔



شمال مشرقی سوئزر لینڈ کے شہر اپین زیل کا صدر بازار جس کی عمارتیں مخصوص وضع کی ہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم چاروں کسی راہ بر کے بغیر باہر نکلے اور ایک گھنٹے تک جنیوا کی گلیوں میں گھومتے اور لوگوں سے ملتے رہے ۔ آٹھ بجے رات کو واپس آئے ۔ کھانا کھایا اور جلدی ھی بستر پر سب لیٹ گئے ، لیکن نیند میرے لیے اب بھی عنقا رھی ۔ میرا خیال تھا کہ آنکھ جلد لگ جائے گی ، لیکن کچھ دیر کروٹیں لینی پڑیں ۔ شاید آدھی رات کو سوگیا ۔

## جنیوا سے زیورخ

یہ ھوٹل کہ جس میں ھمارا قیام ہے ، ایک لحاظ سے چوں چوں کا مربا ھے ۔ اس کا نام فرانسیسی زبان کے اعتبار سے " لاریزی دان ،، ھے ۔ بڑی خرابی یہ ھے کہ اس کے کمروں میں فرش لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا ھے ، جن کے جوڑ کثرت استعمال کے باعث ڈھیلے پڑ چکے ھیں ، اس لیے کہیں کہیں سے اونچے نیچے ھوگئے ھیں ۔ اس فرش پر چلا جائے تو تختوں کے دبنے سے چوں چوں کی آواز ضرور نکلتی ھے ۔ اتفاق سے مجھے پانی پینے کے لیے رات کو کئی بار اٹھنا پڑگیا ۔ کمرے میں برف کا کوئی انتظام نہیں تھا ، لیکن پانی خوب سرد تھا ۔ فرش کی خرابی کے علاوہ پلنگ نہایت بے ھنگم ھیں ۔ تکیے بہت ھی پتلے اور سخت ھیں ، جنھیں نہایت تکلیف دہ کہا جاسکتا ھے ۔ غرض یہ ھے کہ وہ تمام آسانیاں فراھم کی گئی ھیں کہ جن سے شب بیداری کی راھیں ھموار ھوسکتی ھیں ۔ کمرے اور غسل خانے کی دیواروں پر شیشے لگے ھوئے ھیں ۔ انھیں دیکھ کر اللہ کی شان یاد آتی ھے ، کیونکہ یہ التزام اسی ھوٹل میں دیکھا گیا ھے ۔ ذرا دیر کے لیے غسل خانے کی بتی روشن کی جائے تو تمام کمرہ جھلمل جھلمل کرنے لگتا ھے ۔ رات کو جس ذھنی سکون کی تلاش رھتی ھے ، اس پر

برا اثر پڑتا ہے ۔ اس طرح اچھا خاصا رت جگا ہوگیا ۔ یہ غنیمت ہے کہ بچیاں اور خانم ڈی سلوا اپنے کمرے میں سوتی رہیں ۔ نہ ان میں سے کوئی اٹھا نہ تختوں نے چوں چوں کی ، لیکن مجھ پر قیامت کی گھڑیاں گزر گئیں ۔ آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی ، احتیاطاً بتی بھی نہ جلائی ۔ اس لیے مطالعہ نہ کرسکا ۔ صبح پانچ بجے بستر سے اٹھ گیا ۔ اپنے معمول کے خلاف گرم پانی سے غسل کیا ، جس کا غسل خانے میں اہتمام تھا ۔ اس طرح تھکن دور ہوگئی اور اعضا شکنی سے نجات مل گئی ، گھڑی دیکھ کر وضو کیا اور نماز فجر ادا کرلی ۔

## قومی ترانہ

ایک غیر مانوس موسیقی کی آواز سنائی دی تو کھڑکی کے قریب جا کر کان لگا کر سنا ۔ چونکہ اتوار کا دن تھا اور آواز کا زیرو بم بھی بتاتا تھا کہ وہ قومی ترانہ تھا ، اس لیے میں نے اسے دلچسپی سے سنا ۔ سوئزر لینڈ کا ہو یا پاکستان کا ، قومی ترانے کی دھن صوتی اثرات کی وجہ سے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے ۔ جب تک اسے گا کر نہ سنایا جائے ، الفاظ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا ۔ لیکن وہاں صورت یہ تھی کہ اگر الفاظ ادا بھی ہوتے تو سمجھ میں کیسے آتے ۔ ظاہر تھا کہ زبان جرمن ہوگی یا اطالوی ۔ انگریزی کا بھی امکان نہیں تھا ، کیونکہ اسے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے ۔

سوئزر لینڈ کے ترانے کی تاریخ خاصی دلچسپ اور قدیم ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ال بیرک زوائی سگ نامی ایک راہب نے ، جو آری جھیل کے کنارے بائن نامی گاؤں میں ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوا تھا اور ویٹنگن اور گاؤ نامی ایک خانقاہ میں رہتا تھا ، ایک نغمہ مرتب کیا جو عوام میں اس قدر مقبول

ہوا کہ ہر شخص کی زبان پر آ گیا - ۱۸۴۱ء میں جب وہ خانقاہ بند ہوگئی تو راہب نے بریگنز کے قریب میہرے راؤ کے مقام پر رہنا شروع کردیا۔ وہاں ایک موسیقار لیون ہارڈ وڈمر سے ملاقات ہوگئی، جو زیورخ کے قریب ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا تھا - گویا وہ راہب سے صرف ایک سال چھوٹا تھا - ان کے مابین مراسم بڑھے تو وڈمر نے کہ جو ایک چھاپہ خانے کا منیجر تھا، اس نغمے کو غیرفانی بنانے کے لیے اس کی دھن تیار کردی جو گھر گھر سنائی دینے لگی - دو سال بعد نغمے کے الفاظ شائع بھی ہوگئے -

یہ اس زمانے کا ذکر ہے کہ جب سوئزر لینڈ آزاد نہیں تھا - دوسروں کا اس پر تسلط تھا - اس لیے وہ نغمہ قومی ترانہ نہ بن سکا، بالکل اسی طرح جیسے برصغیر کی تقسیم سے قبل انگریزوں کے دور میں اس ملک کا کوئی قومی ترانہ نہیں تھا - بندے ماترم صرف ہندوؤں کی تخلیق تھا اور وہی اسے نجی طور پر الاپ لیتے تھے - قومی سطح پر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی -

۱۹۶۱ء میں سوئزر لینڈ کی وفاقی کونسل نے فیصلہ صادر کیا کہ آزمائشی طور پر تین سال کے لیے ایک ترانہ مرتب کرلیا جائے جو فوج اور غیر ملکوں میں قائم شدہ اپنے سفارت خانوں میں استعمال ہوسکے - تاہم وڈمر کا ترانہ، جو اس وقت بھی مقبول تھا، عوام کے لیے ذریعۂ اظہار بنا رہا۔ وڈمر کا ترانہ ہر ریاست میں ایک علاحدہ دھن کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا - اعلا سرکاری حکام نے اس پہلو کو شہریوں کے ذوق موسیقی پر چھوڑ دیا تھا - چنانچہ ''جس کی ڈفلی اس کا راگ'' کے مصداق ہر ریاست میں ایک ہی ترانے کی دھن جداگانہ تھی - ملک کے آئین میں اس وقت قومی ترانے کا ذکر تک نہیں تھا -

تین سال کی آزمائشی مدت گزر جانے کے بعد حکومت کے

ارکان نے ریاستی حکام اور مختلف اداروں کے سربراہوں سے رائے طلب کی تو ان علاقوں کے سوا ، جہاں کی اکثریتی زبان فرانسیسی تھی ، سب نے رائے دی کہ ال بیرک زوائی سگ کا نغمہ لیون ہارڈ وڈمر کی دھن کے ساتھ منظور کیا جائے ، کیونکہ غیرسرکاری طور پر ان دونوں کو قبول عوام حاصل تھا ۔ یہ ۱۹۶۵ء کا ذکر ہے ۔ فرانسیسی اور اطالوی بولنے والوں نے پھر بھی اپنے ترانے الگ الگ مرتب کیے ۔ ان سے قطع نظر دو تین ریاستوں میں فیڈرل کورل سوسائٹی نے اپنا نغمہ بالکل ہی الگ رکھا جو ۱۹۲۸ء سے ان میں رائج تھا اور جسے ذگ کے میوزک ڈائرکٹر بونی فاز کوھنی نے مرتب کیا تھا ۔ اس طرح سرکاری سرپرستی کے باوجود ملک میں کئی قومی ترانے رائج رہے ۔

آخر ایک بار پھر حکومت نے استصواب رائے کا سلسلہ شروع کیا ۔ بہت سی تجاویز آئیں ، جن میں سے بعض مضحکہ خیز بھی تھیں ۔ مثلاً مشورہ دیا گیا کہ چونکہ ایسے الفاظ اور دھن کا ملنا دشوار ہے جو دور حاضر اور زمانۂ مستقبل کے لیے موزوں ہو ، لہذا اسے پائدار شکل نہ دی جائے ۔ بلکہ ہر عہد میں لوگ اپنے اظہار کا طریقہ اختیار کرلیا کریں ۔ یہ بھی کہا گیا کہ ترانہ ایک دقیانوسی چیز ہے ، لہذا اسے اختیار کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ دلیل بھی پیش کی گئی کہ اگر ملک کے باشندے روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے اپنے آبا و اجداد کے زمانے کی کوئی مناجات پسند کرنا چاہیں تو انہیں کامیابی نہیں ہوگی ، کیونکہ اب قدریں بدل چکی ہیں ۔ اور جب انیسویں صدی سے قبل عام لوگ کسی ترانے کے بغیر زندگی بسر کرسکتے تھے تو اب کیا قباحت ہے ۔

تاہم کثرت رائے کی بنیاد پر ہربرٹ میئر کا مرتب کردہ

ترانہ اور اس کے لیے پال برک ہارڈ کی تیار کردہ دھن منظور کرلی گئی ، لیکن پھر بھی اس کو سنانا اور بجانا یا اس موقع پر احتراماً کھڑا ہونا لازمی قرار نہیں دیا گیا ۔ اس ترانے کے الفاظ ، جو معنی و مفہوم کے اعتبار سے ملک کی سب زبانوں میں یکساں ہیں ، اردو زبان میں اس طرح ادا کیے جاسکتے ہیں :

آؤ ہم چلیں آزاد لوگوں کے میدانوں میں
جہاں لوگ مذاکرات اور تبادلۂ خیالات کرتے ہیں
اور امن پسندی کے اعمال سے ہمارے روز و شب خوشگوار کرتے ہیں ۔
ہم اپنے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے رکھنے چاہتے ہیں
ان تک کے لیے بھی جو ہم پر شک و شبہ کرتے ہیں ۔
سب کے لیے عدل و انصاف ہماری زمین سے فروغ پائے
تاکہ ہمارے مرنے کے بعد بھی لوگ ہمارے گن گاتے رہیں
اور ہم جھوٹی کہانیوں کو دفن کردینگے
اور نئے بتوں کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے ۔
تاہم ماضی کی صدائیں کانوں میں گونجیں گی
اور الفاظ صداقت کو سمجھنے کی ترغیب دینگے ۔

اس میں شک نہیں کہ ترانے کے الفاظ بہت موثر ہیں ، لیکن مجموعی طور پر وہ اتنا طویل ہے کہ شاید مقامی باشندے بھی اسے شروع سے آخر تک سننا گوار نہ کرتے ہونگے اور نہ اتنی دیر اس کے احترام میں خاموش کھڑے رہتے ہونگے ۔ میں نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی ۔ ہر قسم کی گاڑیاں تیزی کے ساتھ سڑک پر دوڑ رہی تھیں ۔ پیدل چلنے والے بھی اپنے اپنے راستے پر گامزن تھے ۔ میرا ذاتی تاثر یہ تھا کہ تقریباً سبھی ملکوں میں قومی ترانے کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے ۔ اپنے ملک میں بھی سرکاری

حکم یہی ہے کہ جب بھی قومی ترانہ شروع ہو ، اس کے احترام میں خاموش کھڑے ہوجاؤ ، لیکن اس حکم کی تکمیل کم ہوتی ہے ۔ سنیما گھروں میں فلم ختم ہونے کے بعد ترانہ شروع ہوتا ہے ، لیکن لوگوں کو اپنے گھر بھاگنے کی جلدی ہوتی ہے ۔ لہذا اس کے خاتمے سے قبل آدھے سے زیادہ ہال خالی ہوچکتا ہے ۔ صدر مملکت جب بھی کسی اجلاس میں شریک ہوتے ہیں ، ان کی آمد اور رخصت پر ترانہ بجانے کا دستور ہے ، لیکن ٹی ۔ وی پر جو جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں ان سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ صرف اگلی چند قطاروں کے حاضرین اس روایت کی پابندی کرتے ہیں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے خود بھی اس پر عمل نہیں کرتے ۔

## قومی پرچم

قومی ترانہ سننے کے ساتھ ساتھ میری نظر سامنے والی کوٹھی کی چھت پر پڑی تو قومی پرچم لہراتا نظر آیا ۔ معلوم نہیں یہ کسی خاص تقریب کی علامت تھی یا محض اتوار کی رعایت سے وہ ہوا میں لہرا رہا تھا ۔ یہ بھی محض رسم کی ادائی تھی ۔ اب تو اسلامی ملکوں میں بھی مسلمان قومی پرچم کو سلامی دینے لگے ہیں ۔ ورنہ یہ رسم صرف غیر مسلموں تک محدود تھی ۔ قومی پرچم یقیناً افواج میں مظاہرہ ہمت و شجاعت کی ترغیب دینے کے لیے ایک اچھا علامتی نشان ہے ، لیکن اس حد تک نہیں کہ اسے ایک ذی حیات چیز سمجھ کر سلام کرنے لگیں ، یا اس کے سامنے سرنگوں ہو کر کھڑے ہوجائیں ۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو شاید وہ وقت بھی آجائے کہ اس سے رحم و کرم کی درخواست کی جانے لگے ، بالکل اسی طرح جیسے بعض بت پرست اقوام اپنے دیوتاؤں اور دیویوں سے خیر و برکت کی التجا کرتے ہیں ۔

سوئزر لینڈ کے باشندے یوں تو کئی مذاہب کے پیرو ہیں ، لیکن اکثریت نصرانیت کی طرف مائل ہے ۔ ان میں کیتھولک بھی ہیں اور پروٹسٹنٹ بھی ۔ اس لیے صلیب کا نشان ہمیشہ سے ان کے پیش نظر رہا ہے ۔ عہد قدیم میں ہر فرقہ اپنا ایک علاحدہ نشان پرچم پر بناتا تھا ، لیکن وفاق کی تشکیل کے بعد سرخ زمین پر سفید صلیب کا نشان سارے ملک کے لیے تسلیم کرلیا گیا ۔ وفاق سے پہلے محض چند ریاستوں نے اسے اختیار کیا تھا ۔ خون کی طرح سرخ پھریرا ان کی جنگجو طبیعت کا مظہر ہے ، لیکں سفید صلیب کے مل جانے سے وہ موت پر زندگی کی برتری کا امتیازی نشان بن گیا ۔

سفید صلیب کا نشان دوسرے رنگ کی زمینوں پر اس سے بھی زیادہ قدیم ہے ۔ ۱۲۸۹ء میں جب سوئزر لینڈ کے باشندے برگنڈی کے لوگوں سے برسر پیکار ہوئے تو صلیب والا پھریرا اس وقت بھی رائج تھا ۔ ہیپس برگ کے بادشاہ رڈولف اول نے اس کی منظوری دی تھی ۔ اس وقت جھلی یا چمڑے کے ٹکڑے کاٹ کر پرچم بنائے جاتے تھے ۔ عام طور سے اس نشان کو اس زمانے میں ایک " مقدس مملکت " کہا جاتا تھا ۔

صلیب کا نشان لوگوں کو اتنا پسند تھا کہ ۱۳۳۹ء میں جب لاؤپن نامی جنگ کے بعد چند ریاستوں کا وفاق بنا تو فوجی اور بعض شہری بھی سفید صلیب کا نشان اپنے لباس پر ٹانکنے لگے ۔ پندرھویں صدی کے وسط میں جب زیورخ اور برابر کی دوسری ریاستوں کے درمیان جنگ ہوئی تو دونوں طرف کے فوجی یکساں قسم کی صلیب کے نشان اپنی وردی پر لگائے ہوئے تھے ۔ اس سے مغالطہ ہوا تو رنگ کا فرق اختیار کیا گیا ۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ صلیب کے لمبے نشان کے بجائے چھوٹے نشان رہ گئے ۔

یعنی اس کی چاروں پٹیاں برابر کی ہوگئیں ۔ گویا حساب میں جمع کی علامت (+) کے مانند ان کو تبدیل کرلیا گیا ۔

۱۷۹۸ء میں جب سوئزر لینڈ کی پرانی حکومت ختم ہوگئی اور ہیلوے شین جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو اس نے سبز سرخ اور زرد پٹیوں کا نشان اپنایا ، لیکن وہ زیادہ عرصے نہ چل سکا ۔ ۱۸۱۵ء میں وفاق نے نئی شکل اختیار کی اور ملک کی سب ریاستوں نے یکساں حیثیت حاصل کرلی تو ایک بار پھر سرخ زمین پر سفید صلیب کا نشان اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا جو آج تک رائج ہے ۔

۱۸۶۴ء میں ، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ، انجمن صلیب احمر کا قیام عمل میں آیا جسے اسی ملک کے ایک خدا ترس باشندے کی سعی و کاوش کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے تو قومی پرچم کے نشان کو رنگوں کے اختلاف کے ساتھ اختیار کیا گیا ۔ یعنی اس کا امتیازی نشان سفید زمین پر سرخ صلیب قرار پایا ۔ یہ نشان بھی کسی تغیر کے بغیر آج تک برقرار ہے ۔

میں اس پرچم کو دیکھتا رہا جو نگاہوں کے سامنے لہرا رہا تھا ، حتیٰ کہ دوسرے کمرے میں کچھ آہٹ ہوئی جس سے اندازہ ہوگیا کہ میرے ہم سفر بھی بیدار ہوگئے ہیں ۔ ہماری ہدایت کے مطابق ہوٹل کے ملازمین نے سوا چھے بجے معمولی ناشتہ لگا دیا ۔ اس سے فارغ ہوکر ہم سب پونے سات بجے ہوٹل سے ہوائی میدان کی طرف روانہ ہوگئے ۔ جنیوا کا ہوائی مستقر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا ۔ ہم پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گئے ۔

جہاز پر سوار ہونے کا وقت آیا تو ایک بار پھر احساس ہوا کہ پاس پورٹ کے مراحل سے گزرنا ہے ۔ اصل پاس پورٹ برن میں

تھے ۔ ان سے متعلق کچھ دفتری کارروائی ہونی تھی ۔ یہ غنیمت ھے کہ میں نے سفارت خانہٗ پاکستان سے چاروں پاسپورٹوں کی رسید لے لی تھی جو کہ اس موقع پر کام آگئی ۔ اس طرح ھمیں سوئس ائیر کے جمبو جیٹ پر سوار ہونے کا موقع مل گیا ۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ اندرونی پرواز کے سلسلے میں صرف تیس منٹ کا مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے یہ بھاری بھر کم جہاز کیوں چلایا گیا جبکہ اس میں کچھ نشستیں خالی بھی پڑی تھیں ، لیکن بڑے ملکوں کی باتیں بڑی ہوتی ھیں ۔

جہاز ٹھیک آٹھ بجے پابندیٗ وقت کے ساتھ جنیوا کے ہوائی میدان سے اڑا اور ٹھیک ساڑے آٹھ بجے زیورخ کے ہوائی میدان پر اتر گیا ۔ وھاں سوئس فاؤنڈیشن یعنی پرو ھیلویتیا کی جانب سے محترمہ ھاں وتھیرچ صاحبہ موجود تھیں ۔ انہوں نے پرتپاک طریقے سے ھمارا استقبال کیا ۔ ان کے حسن سلوک کی مجھے داد دینی پڑی ۔ وہ ایک گاڑی ساتھ لائیں تھیں ، مگر ہم کو سامان کی وجہ سے ایک ٹیکسی بھی لینی پڑی ۔ ہوٹل ھلم ھوس گارنی تک اس کا کرایہ سینتیس فرانک ھوگیا ۔ ایک فرانک چار رپے کے برابر ہوتا ھے ۔ گویا ہم کو پاکستانی اعتبار سے ایک سو اڑتالیس رپے ادا کرنے پڑے ۔ یہ کرایہ ھماری جیب سے نہیں گیا بلکہ پروھیلویتیا کی طرف سے ادا کیا گیا ۔ ان کی یہ عنایت قابل تشکر تھی ۔ تاھم میں نے اس شہر میں گرانی کا اندازہ اس کرائے سے لگا لیا ۔ ہم جنیوا کے جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ خاص معیاری نہیں تھا ۔ اس کا کرایہ فی کس ایک سو فرانک یعنی چار سو رپے فی کس تھا ۔ مجھے ایک لمحے کے لیے سوچنا پڑا کہ زیورخ میں ہوٹل کا کتنا کرایہ ادا کرنا پڑتا ھے ۔

ہم ہوٹل میں پہنچے تو ناشتے کا انتظام ہونے لگا ۔

چونکہ جنیوا سے روانگی کے وقت سبھی گھبراہٹ میں تھے اور ناشتہ بھی معمولی سا تھا ، اس لیے اس اہتمام کو روکا نہ جاسکا ۔ میں نے بھی دودھ کا ایک گلاس نوش جان کیا ۔ باقی سب نے چائے پی ، انڈے کے ساتھ توس بھی کھائے گئے ۔ میں نے اپنے جسم میں توانائی محسوس کی ۔ میں ایک پروگرام بنانا چاھتا تھا کہ جہاں برف باری ہوئی ہے اور برف جمع ہے اور لوگ اس کی سطح پر سکی انگ ( شی انگ ) کررہے ھیں ، وھاں جاؤں اور سب کو ساتھ لے جاؤں ۔ اس کھیل کا نظارہ بہت دلچسپ ہونے کے ساتھ حیرت انگیز بھی ھوتا ہے ، لیکن پتہ چلا کہ موسم ابر آلود ہے ۔ اس لیے صحیح کیفیات سے لطف اندوز ھونا ممکن نہیں ھوگا ۔ لہذا نعم البدل کے طور پر فیصلہ کیا گیا کہ یہ وقت عجائب گھر دیکھنے میں صرف کریں ۔ مجھے ذاتی طور پر مصوری اور نقاشی سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے ، مگر جب ہم سفر بھی ساتھ ھوں تو ان کے جذبات و خواھشات کا احترام ضروری ہے ۔ ساتھ جانا ھی پڑا ۔ یعنی یہ ممکن نہیں تھا کہ میں دونوں بچیوں اور خانم ڈی سلوا کو وھاں بھیج کر خود ھوٹل میں رھوں اور مطالعہ کرتا رھوں ۔ یقیناً ان ساتھیوں کی دل جوئی کرنا بھی میری ذمہ داری ہے ۔

لیکن عجائب گھر جانے سے قبل مجھے ایک دم خیال آیا کہ آج اتوار ہے ۔ خانم ڈی سلوا ضرور کسی گرجا گھر میں جانا پسند کرینگی ، کیونکہ وہ مذھبی اعتبار سے کافی سخت ھیں اور پابند عبادت ۔ وطن عزیز میں سخت سردی ھو یا شدید گرمی ، طوفان باد و باراں ھو یا سیاسی ھنگاموں کا خدشہ ، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے حضور پہنچنے میں غفلت یا کوتاھی نہیں کرتیں ۔ اس سفر کے دوران میں میری وجہ سے ناغہ نہ ھونا چاھیئے تھا ۔ مجھے معلوم تھا کہ سوئزر لینڈ میں خصوصاً زیورخ میں



سینٹ پیٹر کے گرجا گھر کے سامنے جنیوا کا ایک پُر سکون علاقہ جہاں بہت کم چہل پہل ہوتی ہے۔

پروٹسٹنٹ عقیدے کے لوگوں کی اکثریت ہے، اسی لیے رومن کیتھولک کے گرجا گھر کم ہیں۔ عقائد میں اختلاف کی بنا پر اس سر زمین پر بہت خون خرابے ہوئے تھے۔ بیشتر رومن کیتھولک موت کے گھاٹ اتارے گئے تھے۔ چنانچہ اس اعتبار سے یہاں کی تاریخ دلی کی ۱۸۵۷ء کی تاریخ سے کسی طرح کم خونی نہیں تھی، لیکن رومن کیتھولک یکسر نیست و نابود نہیں ہوئے۔ رفتہ رفتہ انہیں عبادت کی اجازت مل گئی اور ان کے گرجا گھر آباد ہوگئے۔

میں نے صورت حال سے مسز وتھیرچ کو آگاہ کیا اور انہوں نے ہمیں ایک گرجا گھر پہنچا دیا اور میری درخواست پر وہ چھٹی کر گئیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اتوار کے دن، جو عام تعطیل کا دن ہوتا ہے، انہیں مصروف رکھوں۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس عقیدے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انہیں بھیج دینا اس لیے بھی مناسب تھا کہ موسم کے اعتبار سے کوئی خاص سیر و تفریح ممکن نہیں تھی۔ اور جہاں تک عجائب گھر دیکھنے کا تعلق تھا وہ ان کے بغیر بھی ہوسکتا تھا، کیونکہ ان مقامات پر سرکاری گائڈ ہوتے ہیں جو ہر چیز کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض صورتوں میں وہ "ایجاد بندہ" کے اعتبار سے مبالغہ آرائی بھی کرتے ہیں تاہم بہت سی مفید باتیں ذہن نشین کرادیتے ہیں۔

مسز وتھیرچ نے جاتے جاتے مجھ سے باتیں کیں اور بڑے شد و مد کے ساتھ مجھے ترغیب دی کہ میں سوئس فاؤنڈیشن کے پیش کردہ نو سو فرانک قبول کرلوں۔ وہ کوئی خیرات نہیں تھی۔ سوئس حکومت اہل علم کے لیے مطالعے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ چونکہ ہمارے سفر کا اہتمام فاؤنڈیشن کی طرف سے

ہوا تھا اس لیے یہ رقم قبول کرلینی ہی چاہیئے تھی ۔ انہوں نے یہ اصول بھی سمجھایا کہ مہمان عالم کے جملہ اخراجات ادا کیے جاتے ہیں ، لیکن چونکہ میں تنہا نہیں تھا اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میرے ذاتی اخراجات کا حساب الگ رکھا جائے اس لیے ایک سو فرانک یومیہ کے حساب سے رقم ادا کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا ۔ اگر میں تنہا ہوتا تو میرا قیام بھی اعلا ہوٹلوں میں ہوتا اور تمام اخراجات حکومت ادا کرتی ۔ مسز وتھیرچ نے افسوس کا اظہار کیا ، لیکن میں نے ان کو مطمئن کردیا کہ وہ کچھ محسوس نہ کریں ، کیونکہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے بلکہ خوش ہوں کہ اس سفر میں بچیاں اور سکریٹری ساتھ ہیں ۔

گرجا گھر میں خانم ایل ۔ اے ۔ ڈی سلوا اور ان کے صاحبزادے ٹیرنس ڈی سلوا ایک ساتھ داخل ہوئے ۔ میں نے بھی آج گرجا گھر میں جا کر بیٹھ جانے کا فیصلہ کیا ۔ شروع سے آخر تک بالکل خاموش بیٹھا رہا اور جو کچھ میرے مذہب نے بتایا ہے ، حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر غور کرتا رہا ۔ خطبہ جرمن زبان میں ہو رہا تھا جسے سمجھنا میرے لیے ممکن نہ تھا ۔ میں نے دیکھا کہ پورا گرجا گھر کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ۔ لوگ بہت عقیدت مندی کے ساتھ خطبہ سن رہے ہیں ۔ اندازاً سات ساڑھے سات سو آدمی ہونگے ۔ ان میں زبردست نظم تھا ۔ انتہائی خاموشی طاری تھی ۔ پادری نے دعائیں مانگیں تو سامعین نے بھی کچھ کہا جو شاید ”آمین،، کے ہم معنی ہوگا ۔ سروس ختم ہوئی تو سب عابد مرد و زن انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ باہر چلے گئے ۔ سب کو عبادت گاہ کے تقدس کا احساس تھا ۔

گرجا گھروں میں جا کر مطالعہ میرے لیے کوئی نئی بات نہ تھا ۔ میں نے دنیا کے اکثر و بیشتر بڑے بڑے گرجا گھر جا کر



خلیج لیوسرن کے کنارے گرجا گھر کے زیرِ سایہ جدید وضع کی شاندار عمارتیں اور تفریح گاہ۔

دیکھے ھیں ۔ میرے مطالعے کی بنیاد ھمیشہ یہ رھی ھے کہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین عبادات میں تنظیم کا موازنہ کروں اور اس میدان میں ان کے رجحانات کا مطالعہ کروں ۔ میرا تاثر یہ ھے کہ مسلمان من حیث المجموع اپنی عبادت گھوں، مساجد کی حرمت میں مستعد نہیں ھیں اور ان کی اھمیت کو نظر انداز کیے ہوئے ھیں ۔ کیا عیسائیوں کا طرز و سلوک بھی ایسا ھی ھے؟

یہاں آج ”شب ھمدرد،، کے ضمن میں یہ بات میرے ذھن میں آئی کہ اسے خالصاً مذھبی رنگ دیدیا جائے یعنی اس میں اور ”شام ھمدرد،، میں ایک امتیازی حیثیت قائم کی جائے ۔ ھر جمعرات کی رات کو نماز عشا ادا کرنے کا خصوصی انتظام کیا جائے اور اس موقع پر عبادت اور خطبے کو اھمیت کے ساتھ قائم کیا جائے ۔ اس طرح اسلامی اخلاق کی تحریک کا آغاز کیا جائے ۔ اس مقصد کے لیے کسی مسجد کو بھی مقام اجتماع بنایا جاسکتا ھے ۔ یوں تو کراچی میں میری قیام گہ کے قریب ھی شکارپور کولونی کی مسجد مناسب رہ سکتی ھے ، لیکن ھمدرد مطب کے قریب آرام باغ کی مسجد بہتر رھیگی، کیونکہ عوام کے لیے وھاں آنا اور فارغ ھوکر واپس جانا آسان ھوگا ۔ کراچی کے علاوہ لاھور ، راولپنڈی ، حیدرآباد ، سکھر ، لائل پور اور دوسرے بڑے شھروں میں بھی یہ سلسلہ شروع ھوسکتا ھے ۔

میں گرجا گھر سے باھر آیا تو میں نے دیکھا کہ لوگ رنگ برنگ لباسوں میں موسم بہار کی آمد آمد کا جشن منارھے ھیں ۔ اس ملک میں کارنیوال کا ھفتہ شروع ھوگیا تھا ۔ فینسی ڈریس زیب تن کر کے ڈھول تاشے سڑکوں پر بجائے جارھے تھے ۔ معلوم ھوا کہ بازل میں تو اس جشن بہار کے لیے ایک دن کی عام تعطیل کردی گئی ھے ۔ ھوٹل پہنچ کو کھڑکی سے باھر نظر ڈالی

تو یہ معلوم ہوا کہ کوئی جلوس جارہا ہے ۔ لوگ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ سڑک پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی ۔ اندازہ ہوا کہ رات بھر یہ رنگ رلیاں جاری رہیں گی اور دوسرے دن سے لوگ اپنے مشاغل حیات میں مصروف ہوجائینگے ۔ لاہور کے میلہؑ بسنت اور سوئزرلینڈ کے جشن موسم بہار میں میں نے بڑی مماثلت پائی !

زیورخ میں سردی بڑھ گئی ۔ موسم ایسا نہیں رہا کہ کہیں باہر جایا جاسکے ۔ میں نے محسوس کیا کہ سعدیہ ، فاخرہ اور خانم ڈی سلوا میں سے کوئی بھی میوزیم جانے کے پروگرام کے لیے آمادہ نہیں ہے ۔ لہذا میں نے مکمل آرام کا فیصلہ کرلیا ۔ میں محترم مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن ساتھ لایا تھا ۔ مطالعے کے لیے بیٹھ گیا ۔

زیورخ کا ہوٹل بہت ہی آرام دہ تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حال ہی میں تعمیر ہوا ہے اور نئے ساز و سامان سے لیس ہے ۔ کمروں کا انتظام بہت اعلا تھا ۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کم جگہ میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کردی گئی تھیں ۔ یقین کرلینا پڑا کہ اس ہوٹل کی آرائش و زیبائش میں کسی بہت ہی نفیس مزاج آرٹسٹ کو دخل حاصل تھا ۔ اس کے علاوہ تمام کارکنان کی بلند اخلاقی دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی ۔ ایک خاتون ، جو شاید ہوٹل کی مالکہ تھیں ، نہایت ملنسار ، بلند اخلاق اور خوش مزاج تھیں ۔ انہوں نے ہم سب کے دل موہ لیے ۔ مجھے ان کے عام برتاؤ سے اطمینان نصیب ہوا اور رائے قائم کی کہ کسی ملک کے ایک آدھ شہری کے برتاؤ سے متاثر ہوکر اس ملک کے عام لوگوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن عام طور پر ہوتا یہی ہے اور ایک شخص اپنے خراب برتاؤ سے

پوری قوم کو بدنام کردیتا ہے ۔ ان سے قبل بعض لوگوں کے برتاؤ نے مجھے مایوس کیا تھا ۔

## آخری قدم

رات بڑے اطمینان کی نیند آئی ۔ ایسی نیند کہ کوئی ذہنی الجھن باقی نہیں رہی ! تاہم اخراجات کے مقابلے میں روپے پیسے کی کمی خاصی پریشان کن تھی ۔ جیب میں رقم کم تھی اور سفر طویل تھا ۔ ہمیں سوئزر لینڈ کے بعد لندن بھی جانا تھا ۔ ہماری آئندہ آسائش کا انحصار اس بات پر تھا کہ ہم لندن پہنچ کر اپنے اخراجات میں کس طرح کتر بیونت کرسکتے تھے ۔ اگر لندن میں مالی مشکلات کا کوئی حل نکل آیا تو ذہنی پریشانی کم ہوجائے گی اور پھر باقی سفر خیریت سے گزر جائیگا ، ورنہ کسی نہ کسی منزل پر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ باقی راہ نامے کو ختم کر کے کراچی پہنچا جائے ۔

یہاں رہتے ہوئے اپنی مشکلات کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ سوئس فاؤنڈیشن نے جو ایک سو فرانک یومیہ کے حساب سے نو دن کے نو سو فرانک یعنی تین ہزار چھے سو روپے پیش کیے ہیں ان کو قبول کرلیا جائے ۔ صرف اسی طرح حالات استوار ہوسکتے تھے ۔ اس طرح آخری منزل تک راہ نامے کے مطابق سفر کی تکمیل ہوسکتی تھی ۔

## اخلاق اسلامی

نماز فجر کے بعد پہلی بار صبح خالی اور اطمینان بخش نصیب ہوئی ۔ میں نے خیالات کا سلسلہ وہاں سے جوڑا کہ جہاں سے لاہور میں ٹوٹا تھا ۔ جناب علامہ علاء الدین صدیقی صاحب اور جناب جسٹس ایس ۔ اے ۔ رحمان صاحب سے " تحریک اخلاق ،، کے بارے میں تبادل خیال کیا تھا ۔ میری رائے تھی کہ پاکستان

میں " تحریک فہم القرآن "، کے ساتھ ھی " تحریک اخلاق "، جاری کرنی ضروری ھے ۔ " شام ھمدرد "، کے اس سال کے اجتماعات میں مذاکرات کا موضوع تھا " قرآن روشنی ھے "، ۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ تحریک شروع کرنی چاھیئے کہ " ھمارا اخلاق اسلامی ھے "، یا مختصراً " تعمیر اخلاق "، اس کا عنوان ھو ، لیکن میں پوری طرح مطمئن نہ ھوسکا ۔ اس میں " اخوت "، جیسے ایک لفظ کی خوبی نہیں ھے " ھمارا اخلاق اسلامی ھے "، پورا ایک جملہ ھے ۔ صرف لفظ " اخلاق "، سے پورا مفہوم ذھن میں نہیں آتا ، تشنگی باقی رھتی ھے ۔ پھر یہ کہ ھمارے معاشرے میں بہت سے لوگوں کا نام اخلاق رکھا جاتا ھے ۔ اخلاق اسلامی کہا جائے تو موجودہ حکومت اس کا رشتہ جماعت اسلامی سے جوڑ دیگی ۔ " تہذیب اخلاق "، سر سید احمد علیہ الرحمتہ کی تحریک کا عنوان رھا ھے ۔ تحریک کا نام کچھ بھی ھو ، لیکن یہ کام ضرور کیا جانا چاھیئے ۔

ایک وقت تھا کہ اخلاق حسنہ مسلمانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا اور سب سے اھم میراث ، اور ان کے لیے باعث افتخار ۔ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ مسلمان تیر و تفنگ اور شمشیر و سناں استعمال کیے بغیر محض اپنے اعلا کردار اور رفعت اخلاق سے ھم سے جیت سکتا ھے اور ھم اسے اپنی بداخلاقیوں کے باعث شکست نہیں دے سکتے ، لیکن آج صورت حالات بالکل مختلف بلکہ برعکس ھے ۔ مسلمان اپنی بد اخلاقیوں کے باعث قعر مذلت میں گرے ھوئے ھیں ۔ نہ رب العزت کی بارگاہ میں پذیرائی کے حقدار ھیں ، نہ آپس میں نیک نامی کے ساتھ یاد کیے جانے کے لائق ھیں اور نہ عالمی معاشرے میں ان کا احترام ھے ۔ صرف اس

لیے کہ اپنی دیرینہ اخلاقی قدروں سے روگرداں ہوکر اس مسلک سے ہٹ گئے ہیں جس کی تربیت قرآن و سنت کی روشنی میں حاصل ہوئی تھی -

ایک وقت تھا کہ مسلمان معلم اخلاق سمجھے جاتے تھے - وہ دنیا بھر کے لوگوں کو نیک کاموں کی تربیت دے کر ان کے اخلاقی معیار کو بلند کرتے تھے - اس طرح خود ان کا اخلاق ضرب المثل ہوگیا تھا - مگر آج ہماری بد اخلاقی ضرب المثل ہوگئی ہے - لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے اس بلند مقام کی یاد دلائی جائے جسے انہوں نے اپنی نادانی سے ترک کردیا ہے اور ترغیب دی جائے کہ اس منزل مقصود کو دوبارہ حاصل کریں -

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
یاد آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

ابن حبان سے روایت ہے کہ کسی نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ و صلم سے دریافت کیا کہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا ہوئی ہیں ، ان میں سے سب سے اچھی اور افضل نعمت کون سی ہے ؟ ارشاد ہوا کہ ”نیک اخلاق“ - ایک دوسری حدیث کے مطابق آپ صلعم نے فرمایا کہ اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا اور مثالی ہو - ایک اور روایت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میں اس دنیا میں اعلا اخلاقی قدروں کو رواج دینے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں - اور اس میں شک نہیں کہ حضور صلعم کی ساری زندگی اخلاق حسنہ کا مجموعہ تھی - آپ صلعم نے اپنے ہر قول اور عمل سے ثابت کردیا کہ وہ بلا شبہ اخلاق حسنہ ہی کی تکمیل کے لیے

تشریف لائے تھے - آپ صلعم عموماً نماز پڑھنے کے بعد جو دعا مانگتے تھے ، اس کا ایک جملہ یہ بھی ہوتا تھا :

"اور اے میرے اللہ ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر ، تیرے سوا کوئی بھی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا - اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو نہیں پھیر سکتا کوئی سوائے تیرے"۔

اخلاقی قدروں کا دائرہ بہت وسیع ھے - ان میں اخلاص و مروت ، عفت و پاکبازی ، شرم و حیا ، خدمت خلق ، حقوق والدین ، حقوق اھل و عیال ، حقوق اساتذہ ، حقوق ھمسایہ ، عہد کی پابندی ، امانت و دیانت داری ، ناپ تول کی صحت ، مستقل مزاجی ، فیاضی ، رحمدلی ، عدل و انصاف ، عفو و درگزر ، حلم و برد باری ، تواضع و انکساری ، خوش کلامی ، ایثار و قربانی ، اعتدال و میانہ روی ، خود داری و عزت نفس ، ثابت قدمی و حق گوئی ، قناعت و بے نیازی وغیرہ جیسی خوبیاں شامل ھیں - اور ان کے برعکس ھر قول و فعل کو بد اخلاقی سے تعبیر کیا جائیگا -

اخلاقی قدروں میں سب سے اونچا مقام ایمان صالح کو حاصل ھے - اور کامل ایمان صرف اسی شخص کا ھوسکتا ھے جس کا اخلاق سب سے اچھا ھو ، ان صفات کے ساتھ جو اوپر بیان کی گئی ھیں - ایمان دار انسان کے لیے متقی و پرھیزگار اور صوم و صلواۃ کا پابند ھونا ضروری ھے - یہ اعمال اخلاق حسنہ کی کسوٹی ھیں - فرمان الٰہی کی روشنی میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کی وضاحت کے مطابق ایمان صالح کی ستر سے زیادہ شاخیں ھیں - ان میں سب سے بڑھ کر وحدت خداوندی کا اقرار ھے - اور سب سے کم تر یہ ھے کہ راستے میں پڑی ھوئی ھر چیز کو ایک طرف ھٹا دیا جائے جس سے کسی دوسرے راہ گیر کو بے خیالی میں تکلیف

پہنچ سکتی ہو ۔ ایمان ہی کی ایک شاخ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے حیا بھی ہے ۔

ان کے علاوہ تین باتیں جزو ایمان ہیں : (۱) اپنی مفلسی کے باوجود اللہ کی راہ میں خیرات کرنا (۲) دنیا میں امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا (۳) اور ذاتی اغراض و مقاصد کو نظر انداز کر کے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنا ۔ اگر انسان ان اصولوں کو اچھی طرح اپنالے تو دنیا کی بہت سی برائیوں کے سیاہ داغ مٹ جائیں اور انسان مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرنے لگے ۔

اقوام متحدہ کے منشور کو ایک اعلا دستاویز سمجھا جاتا ہے ، لیکن غور سے مطالعہ کیا جائے تو مذکورہ بالا اصولوں کی روح اس کی جملہ دفعات میں پوشیدہ ہے ۔ البتہ ان پر عمل کا جہاں تک تعلق ہے ، وہ برائے نام ہے ۔ اسی لیے اس کا اصل منشا پورا نہیں ہوتا ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ کی عبادت کرنے اور دوسرے ارکان اسلام کی پابندی کرنے سے انسان دنیا اور آخرت میں اونچا مقام حاصل کرسکتا ہے ، لیکن ارشاد خداوندی ہے کہ " انسان اپنے حسن اخلاق سے وہی درجہ پاسکتا ہے ، جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے ممکن ہوتا ہے ۔ رسول مقبول صلعم ہر نماز کے بعد یہ دعا مانگتے تھے :

" اے خدا ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی طرف رہنمائی کی توفیق عطا کر ۔ تیرے سوا کوئی بھی بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا ۔ اور تو برے اخلاق کی ترغیبات کو مجھ سے دور رکھ ۔ بے شک برے اخلاق کو تیرے سوا کوئی دور نہیں رکھ سکتا "۔

بڑوں کی عزت کرنا ، چھوٹوں پر رحم کھانا ، قصور وار کو معاف کردینا ، اپنے بلند مرتبے کے باوجود عاجزی و انکساری کے ساتھ دوسروں سے ملنا ، اپنے اهل و عیال ، عزیز و اقارب اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ، دوسروں کی خطاؤں کو نظر انداز کر کے اپنے غصے کو ٹھنڈا کرلینا ، فضول خرچی سے بچ کر اعتدال کی زندگی گزارنا وغیرہ نیک اخلاق ھونے کا پتہ دیتا ھے - اس طرح حسن اخلاق موجب برکت ھوتا ھے اور بد اخلاقی سے نحوست پھیلتی ھے -

چونکہ میرا تعلق طب اسلامی سے ھے اور مریضوں کا علاج معالجہ اور دکھی انسانیت کی دیکھ بھال میرے فرائض منصبی میں شامل ھے ، اس لیے میں نے اخلاقیات کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ھوئے طبی اداروں ، ھسپتالوں اور شفاخانوں کے حسن عمل پر بھی غور کیا اور اس ضمن میں کچھ ھدایات کا نقشہ ذھن نشین کیا تاکہ وطن پہنچ کر کم سے کم اپنے دائرہ عمل میں ان کا خیال رکھ سکوں -

یہ تسلیم کرتے ھوئے کہ بیماروں کی دیکھ بھال کرنا ھسپتالوں کی اولین ذمہ داری ھے اور ایک مقدس خدمت ان کے سپرد کی جاتی ھے ، انہیں ھمیشہ یہ کوشش کرتے رھنا چاھئے کہ مریضوں کی بہترین صورت میں نگہداشت ھو اور جنہیں ھسپتال میں داخل کرنا ضروری ھو ، ان کو لازمی طور پر داخل کیا جائے - اور اس وقت ھر مریض کو اپنے ھی خاندان کا رکن سمجھتے ھوئے اس کی خبرگیری کی جائے - ھسپتالوں کے ارباب اقتدار یہ تسلیم کریں کہ صحت ملی کی حفاظت اور مریضوں کا رکھ رکھاؤ ان کا اولین فرض ھے - انہیں چاھیے کہ دلی ھمدردی اور خلوص قلب سے کام لیتے ھوئے مریضوں کی خبر گیری بالکل سائنسی اصولوں پر کریں اور

انہیں تعلیم صحت دیں تا کہ وہ صحت یاب ہو کر آئندہ احتیاطی تدابیر اختیار کریں اور ان کے لمحات زندگی دراز تر ہوسکیں ۔ ان کے مصائب و آلام کم ہوں اور جن برادران وطن کی خدمت ان کے سپرد ہو ان کی عام صحت بحال ہوسکے ۔

ہسپتالوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں ہم آہنگ تعلقات قائم کریں اور ان کو برقرار رکھیں ۔ نیز کامیاب صورت میں مریضوں کے علاج معالجے اور تیمار داری کے ضمن میں مناسب و موزوں ماحول کی ضمانت مل سکے ۔ نجی اور سرکاری شفاخانوں کی کوشش ہونی چاہیے کہ جملہ بردران ملت کے دلوں میں اعتماد کی شمع روشن ہو اور مریضوں کے دینی مسالک و مذہبی عقائد اور معاشرتی رسوم و روایات کا احترام فروغ پاسکے ۔

جہاں تک ممکن ہو ہسپتال تربیتی منصوبوں کو عمل میں لائیں ، تحقیقات کی سرپرستی کریں اور برادران وطن کی صحت کے لیے انسدادی تدابیر اور بہتری کی ہر صورت ممکن کر دکھائیں ۔ ہرہسپتال دوسرے ہسپتالوں ، صحت اور فلاح و بہبود کے اداروں ، خواہ وہ سرکاری ہوں یا نجی ، اور ان دوسری تسلیم شدہ انجمنوں کے ساتھ تعاون و رواداری کا رشتہ قائم کرے ، جو صحت عامہ کو پروان چڑھانے کے کاموں میں دلچسپی لیتی اور وابستگی کا اظہار کرتی ہوں ۔

جب عوام کو مطلع کرنے کا سوال پیدا ہو تو ہسپتالوں کو چاہیے کہ حقائق پر مبنی اعداد و شمار پیش کریں ، اپنی کامرانیوں کی با مقصد تشہیر کریں اور دوسرے ہسپتالوں یا متعلقہ اداروں اور مرکزوں کی تحقیر نہ کرتے ہوئے صرف اپنے اغراض و مقاصد کا ذکر کریں ۔ انہیں چاہیے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہر اس موثر طریقۂ کار کی حمایت اور ہمت افزائی کریں جس سے

بیماریوں کا بوجھ ہلکا ہو اور حصول صحت کے لیے اخراجات کم کیے جاسکیں -

ہسپتالوں کو چاہئے کہ مریضوں کا علاج کرنے کے ضمن میں وہ مخلص ، دیانت دار اور غیر جانبدار رہیں ، اپنی خدمات کے معاوضے کو ثانوی حیثیت دیں - ہسپتال اپنی حکمت عملی اور عملے کے ساتھ برتاؤ میں ترقی پسندانہ رویہ اختیار کریں اور اس کوشش میں رہیں کہ جدید ترین آلات میسر آسکیں اور اعلا معیار کارکردگی کے مطابق صحیح طریقے پر ان سے کام لیا جاسکے - معیاری دوائیں بھی استعمال کی جاسکیں -

میں نہایت خلوص قلب اور محویت کے ساتھ ان سب پہلوؤں پر غور کرتا رہا - یہ ضروری تھا کہ اس تحریک اخلاق کو اسلامی رنگ دیا جائے - ہم اپنے مذہب سے دور رہ کر کوئی تعمیری کام نہیں کرسکتے - اخلاقی قدروں کو رفعت دینے کے لیے یہ بنیادی چیز ہے - میں نے فیصلہ کیا کہ اس تحریک کو ضرور پھیلایا جائے تاکہ زوال اخلاق سے دامن بچا رہے - اس طرح دوسرے عملی میدانوں میں بھی مثبت نتائج برآمد ہوسکتے ہیں - تمام قوم کا اخلاق سنوارا جاسکتا ہے - اس سلسلے میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اخلاق اسلامی پر موثر لٹریچر جمع کیا جائے - اخلاق اسلامی کی مثالیں جمع کرنا تحریک کی کامیابی کے لیے اشد ضروری ہے - اس ضمن میں تاریخی ، دینی اور نفسیاتی پہلو زیر غور رکھنے ہوں گے -

میرا ایک اجمالی منصوبہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کم سے کم چھے نمونہ ہائے اخلاق اسلامی تیار ہونے چاہئیں ، تاکہ ہم ان کی دو دو ڈھائی ڈھائی منٹ کی فلمیں تیار کراسکیں - اگر یہ فلمیں عمدہ مکالمے اور صحیح ہدایت کاری کے ساتھ تیار ہو گئیں

اور ان کو پاکستان کے تمام سنیما گھروں میں دکھا دیا گیا تو روز مرہ زندگی میں حسن اخلاق کا مناسب تصور مذہبی پس منظر کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں پر مرتسم ہو جائیگا۔ پھر یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ عرب ممالک اور دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے عربی، فارسی اور دوسری زبانوں میں ان کی ڈبنگ ہوجائے تاکہ نمائش کا دائرہ وسیع تر کرکے ان کو وہاں بھی دکھایا جاسکے۔ اس طرح ان ملکوں کو بھی ایسے فلم تیار کرنے کی ترغیب ہوسکیگی۔ یہ فلم سنیما گھروں کے علاوہ ٹی وی کے ذریعے سے بھی عوام کی نگاہوں کے سامنے آسکتے ہیں۔ اس طرح ریڈیو اور ٹی وی کے ارباب اقتدار کو بھی اس موضوع کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دوسرے پروگراموں میں جو اخلاقی اعتبار سے بہت ہی زوال پذیر ہورہے ہیں، بہتری کی صورت پیدا کریں۔ ان کو بتایا جائیگا کہ وہ دامن احتیاط کس طرح پکڑیں۔

اسی منزل کا دوسرا اہم قدم یہ ہوگا کہ پاکستان کے تمام اہل قلم حضرات کو جن میں دانشور، ادیب اور شاعر شامل ہونگے، دعوت دی جائیگی کہ وہ اپنے رشحات قلم میں اخلاق اسلامی کے موضوع پر اظہار خیال کریں اور کرتے رہیں۔ ہمیشہ اس جذبے کو پیش نظر رکھیں کہ حسن اخلاق جزو ایمان ہے۔ مدیران جرائد و اخبارات کا فرض ہوگا کہ وہ ایسے مضامین نثر و نظم کو زیادہ سے زیادہ جگہ دیں۔ ضروری نہیں کہ ہر اشاعت میں چند صفحات ان کے لیے مخصوص ہوں لیکن، ان کو یکسر نظر انداز نہ کیا جائے۔

میں نے اس موضوع کے سب پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے رائے قائم کی کہ ہمیں درس اخلاق کے لیے طلبہ کی اعانت بھی حاصل ہونی چاہیے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس موضوع

پر مذاکرات ہوں ۔ ہمت افزائی کے لیے ان کو انعامات دیے جائیں ۔ ان سے رابطہ قائم کرنا کچھ دشوار کام نہیں ہے ، ایک بار ان تک رسائی ہوجائے اور دلی مقصد بیان کردیا جائے تو ہر مسلمان نوجوان آمادہ و کوشاں نظر آئیگا ۔ مسلمان کو ایک مرتبہ صحیح انداز میں ترغیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ پھر جذبۂ ایمان خود بخود کام کراتا ہے ۔ یہ تحریک چل پڑی تو ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کرنا آسان ہوجائیگا اور اس منزل میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہوگی ۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا ۔ میرے دل و دماغ نے تائید کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ اگر تین ایسے مخلص قلم کار میسر آجائیں جو روابط قائم کرکے مناسب میٹیریل تیار کرسکیں تو اس تحریک کو شروع کرنا اور باقاعدہ نباھتے رہنا مشکل نہیں ہوگا ۔ اس کے اثرات مثبت اور نتائج دیرپا ثابت ہونگے ۔ اس مقصد کے لیے جو تبلیغی ادارہ قائم ہوگا ، اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اہل قلم حضرات کو اخلاق اسلامی کا لٹریچر تمام ذرائع سے حاصل کرکے فراہم کرتا رہے تاکہ ان کو کام کرنے میں سہولت ہو اور اسکیم کبھی رکنے نہ پائے ۔

میں نے اپنے ذہن میں فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے اس احساس اور اجمالی منصوبے سے فی الحال مقررین " شام ہمدرد " کو آگاہ کردینا چاہیے ۔ اور دعوت فکر دیتے ہوئے ان کے وہ مشورے قبول کرنے چاھئیں جو اس اسکیم کو چلانے کے لیے ممد و معاون ہوسکتے ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ سب میرے ہم خیال ہونگے اور ان کے پرخلوص مشورے سونے پر سہاگے کا کام دینگے ۔ ان کے مشوروں کی روشنی میں کام کرنا آسان ہوجائیگا ۔ اس ضمن میں بعض کارکنوں کو معاوضہ ادا کرنا ہوگا ۔ لیکن یہ

کوئی دشوار مسئلہ نہیں ہے ۔ اللہ مسبب الاسباب ہے اور دینی کام میں تائید نصرت اللہی ہمیشہ میسر آجاتی ہے ۔

## سوئس انسٹی ٹیوٹ اوف ٹکنولوجی

میں ان خیالات مین گم تھا کہ برابر کے کمرے سے سعدیہ اور فاخرہ کی آواز سنائی دی ۔ وہ دونوں اور خانم ڈی سلوا بیدار ہوچکی تھیں اور شاید باہر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں ۔ نو بجے سوئس فیڈرل انسٹی ٹیوٹ اوف ٹکنولوجی کی لائبریری دیکھنے کا پروگرام تھا ۔ ہلکا سا ناشتہ کرکے ہم سب وقت مقررہ پر وہاں پہنچ گئے ۔ فاؤنڈیشن کی مسز وتھیرچ ہمارے ساتھ گئیں ۔ وہ بھی اس دوران میں آچکی تھیں ۔ انہیں ہماری طرح پابندیٔ وقت کا بڑا خیال رہتا ہے ۔ یہ ان کا قومی کردار ہے جس کی میں قدر کرتا ہوں ۔ وقت کی قدر و قیمت ہی انسان کو کامرانی کے راستے دکھاتی ہے ۔

## ٹکنیکل لائبریری

لائبریری کے ڈائرکٹر صاحب نے پر جوش انداز میں استقبال کیا اور پھر ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ مدت تک اپنی لائبریری کے مختلف شعبے دکھاتے رہے ۔ وہ جرمن اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں ، مگر انگریزی میں بھی ان کو زیادہ تکلف نہ ہوا ۔ ہم میں سے صرف خانم ڈی سلوا کو فرانسیسی زبان کی شد بد ہے ۔ ڈائرکٹر صاحب بڑے نفیس مزاج کے انسان ہیں ۔ تمام وقت ان کے چہرے پر مسرت کا نور جھلک مارتا رہا ۔

یہ لائبریری ایک قدیم مگر عظیم الشان عمارت میں ہے ۔ اسے موجودہ زمانے کے اعتبار سے آراستہ کرلیا گیا ہے ۔ لاکھوں کتابیں ، لاکھوں نقشے ، لاکھوں مونوگراف ، کوئی سات ہزار ماہنامے مختلف زبانوں کے ، ہزاروں فلم رکارڈ ، ٹیپ کی ہوئی

هزاروں تقریریں وہاں رکھی ہیں - اب تک میں نے جتنی بھی بڑی لائبریریاں دیکھی ہیں ، ان میں سے یہ لائبریری حیرت انگیز کہی جاسکتی ہے - یہ معلومات کا ایک خزانہ ہے ، جہاں بیٹھ کر تحقیقاتی کام کرنے کو جی چاھتا ہے -

جب بھی میں ایسی چیزیں دیکھتا ہوں تو اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں - ٹھنڈا سانس لیتا ہوں - میں سوچتا ہوں کہ پاکستان کے کسی شہر میں ایسی لائبریری کیوں قائم نہیں ہوسکتی - کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اعلا پڑھے لکھے لوگوں کی کمی ہے - آج مجھے رہ رہ کر اس بات کا خیال آیا کہ مزار قائداعظم رح کے پاس کچھ جگہ الاٹ کی گئی تھی تاکہ قائداعظم لائبریری کا طے شدہ پروگرام عمل میں آسکے ، لیکن موجودہ حکومت نے اسے کالعدم کرکے وہاں بازار مارکیٹ اور فلیٹ بنانے کا فیصلہ کیا ہے - کس قدر افسوسناک بات ہے - میرا دل یہ سنتے ہی غم و اندوہ سے بیٹھ گیا تھا - مارکیٹ وغیرہ کے لیے تو پورا شہر پڑا ہے - بہت بڑے بڑے قطعات زمین خالی پڑے ہیں - حیرت ہے کہ ہم لوگ اس درجہ غافل ہوگئے ہیں کہ علم کی طرف ہمارے اذہان کام ہی نہیں کرتے -

## بچوں کے مراکز

سوئزر لینڈ میں اب جگہ جگہ بچوں کے مراکز بن رہے ہیں - زیورخ میں بچوں کا ایک مرکز دیکھنے کا موقع ملا جو " پرو جیو ونٹیوٹ " کہلاتا ہے - یہ شہر کی حدود سے ذرا باہر باخ ویزین کے علاقے میں ہے - ایک فاؤنڈیشن کے ماتحت اس کا نظام قائم ہے - اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ڈاک کے ٹکٹوں کی فروخت ہے - اس مد میں ہر سال کوئی ساڑھے سات ملیون سوئس فرانک جمع ہوجاتے ہیں جو پاکستانی تین کروڑ روپے کے برابر ہوئے -

باقی رقمیں عطیات کی صورت میں وصول ہوتی ہیں جن کی میزان پندرہ ملیون سوئس فرانک یعنی تقریباً چھے کروڑ رپے سالانہ ہوجاتی ہے ۔ فاؤنڈیشن اس کثیر رقم کو بچوں کی تعلیم و تربیت اور حفظ صحت پر خرچ کرتی ہے ۔ بچوں کا یہ مرکز بہت بڑا تو نہیں ہے اور زیادہ اچھا بھی نہیں ہے ، تاہم اس کا دائرۂ کار وسیع ہے اور اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔

میرے ذہن میں "باغ ہمدرد" قائم کرنے کی ایک اسکیم عرصۂ دراز سے کروٹیں لے رہی ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ میں کم از کم ایک شہر کراچی میں ایسے دس بارہ مراکز قائم کردوں جہاں بچوں کو تفریحی مشاغل میسر آسکیں ۔ بچوں کی یہ بہت بڑی خدمت ہوسکتی ہے ۔ میں نے ناظم آباد کے بلاک نمبر ۴ میں پارک کے لیے ایک تجویز کراچی میونسپل کارپوریشن کو تیار کر کے دی تھی ، مگر وہ پاکستان کے مخصوص حالات اور موجودہ حکومت کے مخصوص مزاج کی نذر ہوگئی ہے ۔

## سوئس فاؤنڈیشن

پروہیلویتیا کے ڈائرکٹر جناب لوک بوئموناس صاحب نے آج دوپہر کے کھانے پر مجھے دعوت دی ۔ دعوت نامہ صرف میرے نام ہی تھا ۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ انہیں میرے ساتھ آنے والی بچیوں سعدیہ اور فاخرہ اور خانم ڈی سلوا کا علم تھا یا نہیں ۔ یا بصورت دیگر صرف مہمان خصوصی کو بلانا مقصود تھا ۔ مسز وتھیرچ نے بتایا کہ اس لنچ میں مس نانسی ہاریزا بھی مدعو کی گئی ہیں اور ضرور آئیں گی ، کیونکہ وہ بطور خاص مجھ سے ملنا چاہتی تھیں ۔ وہ زیورخ یونیورسٹی کے شعبۂ سوشل اینڈ پری ونٹو مڈیسن کے ڈوکو مینٹیشن سنٹر کی شریک لائبریرین ہیں ۔ مسز وتھیرچ نے اپنے طور پر خانم ڈی سلوا کو

بھی اس لنچ میں شرکت کی دعوت دے دی مگر یہ رسماً تھی۔ لہذا انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے دونوں بچیوں کا ساتھ دینا پسند کیا اور مسز وتھیرچ کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ مدعو تھیں یا تکلفاً انہوں نے ایسا کیا۔

ڈائرکٹر لوک بوئمو ناس صاحب ایک دل چسپ انسان ثابت ہوئے، لیکن ذرا گہرے آدمی ہیں۔ وہ اس اصول پر کار بند ہیں کہ پہلے بات کو تولو پھر کہو۔ یعنی وہ خیالات کے اظہار میں بہت احتیاط برت رہے تھے۔ میں نے ان سے بات کرتے وقت اس حقیقت کو محسوس کرلیا تھا، لیکن تقاضائے وقت کے لحاظ سے یہ ضروری تھا کہ میں اپنے بارے میں ان کو زیادہ سے زیادہ بلکہ سب کچھ بتادوں۔ اس سے دوہرا فائدہ ہوا۔ میرا یک طرفہ تعارف پوری تفصیل سے ہوگیا اور ادھر وہ کھل کر بات کرنے لگے۔ یعنی گفتگو معمول پر آگئی۔ مس نانسی کو بات کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ مجھے اس لنچ کے موقع پر مس نانسی کی موجودگی غیر ضروری محسوس ہوئی۔

میں پروہیلویتیا کا مہمان تھا۔ میں نے ڈائرکٹر بوئموناس صاحب کو بتایا کہ میں نے کنفرنس عالمی علوم ریاضی کے لیے پروفیسر موسیٹر کو دعوت دے دی ہے۔ اور انہوں نے اس دعوت نامے کو قبول کرلیا ہے۔ یہ بھی کہ دیا کہ وہ پاکستان پہنچ کر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے مہمان ہونگے۔ اس اظہار کا صحیح اثر ہوا۔ پروہیلویتیا ایسے ہی علمی روابط کو اہمیت دیتی ہے جو بین الاقوامی سطح پر ہوں اور دانشوروں کو شریک کرنے میں کسی قسم کا تعصب نہ برتا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ پاکستان اور سوئزر لینڈ میں ایسے علمی روابط بڑھنے چاھئیں۔ انہوں نے میری رائے سے پوری طرح اتفاق کیا۔

یہ مناسب، ہوگا کہ کراچی سے ڈائرکٹر بوئمو ناس صاحب کو ہمدرد فاؤنڈیشن کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی جائیں نیز ان کو ہمدرد کی مطبوعات یعنی تمام کتابوں اور رسالوں کا مکمل سیٹ بھی بھجوایا جائے۔ البیرونی کے ہزار سالہ جشن کے سلسلے میں کورئیر کا حوالہ میں نے ان کو دے دیا۔ اگر انہوں نے اس کا مطالعہ کرلیا تو ہمدرد کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کا موقع مل جائیگا۔

لنچ کے بعد میں ان کے ساتھ پروہیلویتیا کے دفتر گیا۔ میں نے ان کو ہمدرد کی جانب سے چاندی کی ایک ٹرے بطور تحفہ پیش کی اور ان کی شریک حیات کو ایک بنارسی اسٹول دیا۔ اتنے میں مسز وتھیرچ آگئیں۔ میں ڈائرکٹر بوئمو ناس صاحب کو خدا حافظ کہ کر ان کے ساتھ زیورخ یونیورسٹی کے مڈیکل سنٹر چلا گیا۔

## مڈیکل سنٹر میں

بعد دوپہر تقریباً ڈھائی بجے یہاں پروفیسر مائی نارڈ شار صاحب سے تبادل خیال کرنا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے برن یونیورسٹی میں ایک لیکچر دے کر واپس آئے تھے اور پھر چار بجے ایک لیکچر دینے کے لیے انہیں جانا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنی شدید مصروفیتوں کے باوجود میرے لیے وقت نکالا تھا۔ ان سے مسائل طب پر گفتگو ہوئی۔ بطور خاص ان سے سوئزر لینڈ میں لاحق ہونے والی دل کی بیماریوں اور ان کے طریقۂ علاج کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ اندازہ یہ ہوا کہ یورپ کے اور ممالک کی طرح وہاں بھی یہ امراض پریشان کن ہوتے جارہے ہیں۔ میں نے ان کے گوش گزار کیا کہ پاکستان بھی اس منزل میں آگیا ہے۔ پہلے دل کی شکایات صرف شعرا کی زبان

سے سننے میں آتی تھیں ۔ اب اطبا بھی معمولی اختلاج قلب سے لے کر شدید عوارض تک سننے کے عادی ہوگئے ہیں ۔

پروفیسر شار صاحب کی رائے میں سوئزر لینڈ کے باشندے ضرورت سے زیادہ کھانے کے عادی ہیں اور شکر والی چیزوں کے بہت ہی دل دادہ ہیں ۔ اسلئے امراض قلب کا شکار رہتے ہیں ۔ سرطان کے بارے میں ان کی حتمی رائے یہ ہے کہ ٹیلے وژن کی شعاعیں اس مرض کا سبب نہیں ہیں ۔

ان دنوں زیورخ میں یہ مسئلہ بہت زیادہ زیر بحث رہا تھا کہ اگر معالجین کسی مریض کے بارے میں قطعی طور پر یہ فیصلہ کردیں کہ اس کی زندگی بہت جلد موت سے ہم آغوش ہونے کی منزل میں آگئی ہے ، تو اس کو مصنوعی تنفس اور مصنوعی طریق پر تغذیہ وغیرہ سے زندہ رکھنا صحیح ہے یا نہیں ۔ ایک ھسپتال میں اس موضوع پر کافی گڑ بڑ ہوچکی تھی ۔ ھسپتال کی نگراں ڈاکٹرنی صاحبہ نے ان ڈاکٹروں کو اپنے عملے سے برخاست کردیا تھا جنھوں نے ایک مریض کو جس کی بیماری لا علاج سمجھ لی گئی تھی ، خود مرجانے کے لیے اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا ۔ نہ اسے کوئی دوا دی گئی اور نہ پرھیزی غذا ۔ ڈاکٹروں اور ماھرین قانون سر جوڑ کر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے رہے ۔ علمبرداران مذھب کی رائے تھی کہ اسے خودکشی کے مترادف سمجھا جائے ، اور اس لیے ناجائز قرار دیا جائے اور ان معالجین کو ذمہ دار ٹھیرایا جائے جنھوں نے بے پروائی برتنے کا فیصلہ کیا ہو ۔ معالجین مصر تھے کہ ایسے مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج پر توجہ دینا غیر ضروری ہے ۔ ان کی وجہ سے دوسرے مریضوں کا حق چھنتا ہے ۔ اس لیے نامناسب ہے ۔ ماھرین قانون کہتے تھے کہ مریض کے لواحقین کو پوری طرح

صورت حالات سے مطلع کرنے کے بعد تحریری اقرار نامہ لے لیا جائے کہ ہسپتال میں رہتے ہوئے بھی اگر اس کا کوئی علاج نہ ہو تو ہسپتال کے عملے سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی ۔ اس اختلاف رائے کے باعث کوئی آخری فیصلہ ابھی نہیں ہوسکا اور معالجین اپنی من مانی کر رہے ہیں ۔

میں نے پروفیسر شار صاحب سے سوئزر لینڈ میں وقوع پذیر خودکشی کی وارداتوں کی کثرت پر تبادل خیال کیا ۔ ان کی رائے میں یہ رجحان ان لوگوں میں پیدا ہورہا تھا کہ جن کے پاس اس قدر مال و متاع اور اتنا رپیہ ہے کہ اب کسی چیز کی تمنا نہیں ہے ۔ لہذا وہ کیوں زندہ رہیں ۔ کیوں نہ ان کو ختم ہوجانا چاہیئے ۔ یہ دلیل بڑی بے معنی ہے ، لیکن بڑھتے ہوئے اس اس رجحان کو روکنا مشکل ہوگیا ہے ۔

مجھے چار بجے اسی مرکز طب میں مس نانسی صاحبہ سے ملاقات کرنی تھی ، مگر میں نے فیصلہ کیا کہ اس پروگرام پر عمل نہ کیا جائے ۔ میں نے مسز وتھیرچ پر اپنا خیال ظاہر کردیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس ملاقات کو منسوخ کردیں ۔ مس نانسی مجھے متاثر نہیں کرسکی تھیں اور میں سمجھتا تھا کہ ان سے گفتگو کر کے میری معلومات میں کوئی بھی اضافہ نہیں ہوگا ۔

میں نے مرکز سے نکل کر ایک گھنٹے تک بازار کی سیر کی ۔ ایک گھڑی کی مرمت کرائی اور کچھ تحائف خریدے جو زیورخ کے ساتھ مخصوص تھے ۔ وہیں کے دستکار تیار کرتے ہیں ۔ یہ تحفے بہت معمولی تھے ، لیکن گرانی کا یہ عالم تھا کہ ان پر پچاس فرانک یعنی دو سو رپے خرچ ہوگئے ۔ میرا خیال تھا کہ سوغات کے طور پر کچھ نہ کچھ لے جانا چاہیئے ۔

میں ہوٹل واپس پہنچا تو دونوں بچیاں اور خانم ڈی سلوا

میری منتظر تھیں ۔ انہیں معلوم تھا کہ ھمیں رخت سفر باندھنا اور اگلی منزل کی تیاری کرنا ھے ۔

رات آٹھ بجے خانم ڈی سلوا کے صاحبزادے ٹیرنس ڈی سلوا برن سے پاسپورٹ لے کر واپس آگئے ۔ انہوں نے بتایا کہ پاسپورٹ جنیوا چلے گئے تھے ۔ حالانکہ میں برابر جناب گل صاحب کو اطلاع دیتا رھا کہ میں برن سے چاروں پاسپورٹ خود منگوا لونگا ۔ اگر پاسپورٹ برن نہ گئے ھوتے تو لندن کا سفر ناممکن ھوجاتا ۔ بہر نوع بچیوں کو انگلستان کا ویزا نہیں مل سکا ۔ برن میں برطانیہ کے سفارت خانے نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ لندن پہنچ جانے پر سب خانہ پری ھو جائیگی ۔ اب دیکھنا یہ ھے کہ لندن میں کیا گزرتی ھے ۔

نوٹ :-

یہ ایک طویل سفر کا آغاز تھا ۔ میں نے سوئزر لینڈ کے روز و شب تک اس کتاب کو عمداً محدود رکھا ھے ۔ اس کے بعد کا سفر لندن ، پیرس ، فرینکفرٹ ، میونخ ، بیروت ، عمان ، قاھرہ ، جدہ ، مکہ مکرمہ ، مدینہ منورہ تک جاری رھا اور پھر کراچی پر ختم ھوا ۔ اس طویل سفر کی روداد میں نے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھی ھے ۔ شاید میں ان ممالک کے سفر کی رودادیں الگ الگ لکھوں گا ۔ ان دنوں میں سفر نامہ اوسٹریلیا لکھنے میں مصروف ھوں ۔ پھر سفر نامہ جاپان کو ۱۹۸۰ء کے اندر اندر مکمل کرنے کا ارادہ ھے ۔ میں نے امریکا کے جتنے طویل اور غائر سفر کیے ھیں ۱۹۸۱ میں ان کا سفر نامہ انشاللہ تیار کردوں گا ۔

# مطبوعات ہمدرد اکیڈمی ۔ ایک نظر میں

| | | |
|---|---|---|
| ماہ روز | حکیم محمد سعید | ۳۵-۰۰ |
| قرآن روشنی ہے (۴۲ کتابچے) | حکیم محمد سعید | ۱۲-۰۰ |
| شب و روز مع تاثرات سفر دمشق، حلب اور جدہ | حکیم محمد سعید | ۱۰-۰۰ |
| تعلیم صحت | حکیم محمد سعید | ۵-۰۰ |
| ذیابیطس نامہ | حکیم محمد سعید | ۵-۰۰ |
| مقالات ابن الہیثم | حکیم محمد سعید | ۸-۰۰ |
| داستان سرطان | | ۲-۵۰ |
| مسدس بے حالی | سید ضمیر جعفری | ۱-۰۰ |
| دیہاتی معالج حصہ اول | | ۱۲-۰۰ |
| دیہاتی معالج حصہ دوم | | ۱۲-۰۰ |
| اطبائے عہد مغلیہ | کوثر چاند پوری | ۳-۲۵ |
| انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت | آغا محمد اشرف | ۲-۵۰ |
| گاما، رستم زماں گاما پہلوان کی کہانی | خواجہ محمد شفیع | ۲-۵۰ |
| شعلۂ سنگ (افسانے) | کوثر چاند پوری | ۳-۵۰ |
| مقالات شام ہمدرد ۱۹۷۲ء (احترام) | مرتبہ حکیم محمد سعید | ۴۰-۰۰ |
| قلب و صحت | مرتبہ حکیم محمد سعید | ۱۰-۰۰ |
| علامہ اقبال میوزیم ۔ جاوید منزل | تصویر حمیدی | ۱-۰۰ |

## بچوں کے لیے

| | | |
|---|---|---|
| قصہ اژدہا پکڑنے کا | محمود علی اسد و دیگر | ۳-۵۰ |
| پراسرار غار | میرزا ادیب و دیگر | ۳-۵۰ |
| ننھا سراغ رساں | مسعود احمد برکاتی | ۳-۵۰ |
| ابو علی کا جوتا | عبدالحمید نظامی | ۳-۵۰ |
| کھلونا نگر | غازی کمال رشدی | ۴-۵۰ |
| ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی | علی اسد | ۴-۰۰ |
| ننھا سیاح | محمد زکریا مائل | ۴-۵۰ |
| چالاک خرگوش کے کارنامے | معراج | ۴-۵۰ |
| سنہرے اصول | حکیم محمد سعید | ۳-۰۰ |
| جاگو جگاؤ | حکیم محمد سعید | ۲-۰۰ |
| جوہر قابل (مولانا محمد علی جوہر کے سوانح) دوسرا ایڈیشن | مسعود احمد برکاتی | |
| صحت کی الف بے | مسعود احمد برکاتی | ۳-۰۰ |
| چند مشہور طبیب اور سائنس داں | حکیم محمد سعید | ۵-۰۰ |
| غذائیں دوائیں | ادارہ | ۴-۰۰ |

## رسائل

| | مدیر | سالانہ قیمت |
|---|---|---|
| ہمدرد صحت | حکیم محمد سعید | ۴۵-۰۰ |
| یونیسکو پیامی | حکیم محمد سعید | ۴۵-۰۰ |
| ہمدرد نونہال | مسعود احمد برکاتی | ۳۰-۰۰ |
| اخبارالطب | حکیم محمد سعید | ۱۲-۰۰ |
| ہمدرد اسلامیکس (انگریزی) | حکیم محمد سعید | ۷۵-۰۰ |
| ہمدرد میڈیکس (انگریزی) | حکیم محمد سعید | ۱۰۰-۰۰ |

**ہمدرد اکیڈمی، ہمدرد سنٹر**

ناظم آباد، کراچی - ۱۸

همدرد اکیڈمی، پاکستان